ذرا سی میں آس

صالحہ عابد حسین

کتب پبلشرز لمیٹڈ
بمبئی ۱

بار اوّل

دسمبر سنہ ۱۹۴۸ء

پرنٹر سلطان حسین نے سلطانی فائن آرٹ
لیتھو اینڈ پرنٹنگ پریس بھنڈی بازار بمبئی ۳ء
سے چھپوا کر فیروز مستری نے کتب پبلشرز لمیٹڈ
ریگل بلڈنگ اپالو بندر بمبئی ۱ء سے شایع کیا۔

ہند کی امر آتما کے نام

جو مہاتما گاندھی کے روپ میں جلوہ گر ہوئی۔ جس نے یاس کے گھُپ اندھیرے میں اپنے نور باطن سے امید کی جوت جگائی۔

جس نے ہمارے نفرت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے کٹھور دلوں کو محبت کی دھیمی آنچ سے پگھلا دیا۔

فہرست

جہاز اپنا گرداب میں پھنس رہا ہے　　پڑا جس سے جوکھوں میں چھوٹا بڑا ہے
نکلنے کا رستہ نہ بچنے کی جا ہے　　کوئی ان میں سوتا کوئی جاگتا ہے

جو سوتے ہیں وہ مستِ خوابِ گراں ہیں
جو بیدار ہیں ان پہ خنداں زناں ہیں

کوئی ان سے پوچھے کہ اے ہوش والو　　کس امید پر تم کھڑے ہنس رہے ہو
برا وقت بیڑے پہ آنے کو ہے جو　　نہ چھوڑے گا سوتوں کو اور جاگتوں کو

بچو گے نہ تم اور نہ ساتھی تمھارے
اگر ناؤ ڈوبی تو ڈوبیں گے سارے

(حالی)

لوٹ

ستمبر کی تیسری تاریخ ہے۔ اس مرتبہ دہلی میں بارش بہت کم ہوئی ہے۔ سورج دوپہر کو اس قدر تپتا ہے جیسے مئی جون میں۔ پھر شہر میں یوں بھی آج کل آبادی کی زیادتی کی وجہ سے حبس، گھٹن اور بے چینی بڑھی ہوئی ہے۔ مغربی پنجاب اور اضلاع گڑگانوہ وغیرہ کے تقریباً دو لاکھ پناہ گزین دہلی میں ڈیرے ڈالے پڑے ہیں۔ تھوڑے سے اپنے اپنے عزیزوں کے گھروں میں اور زیادہ تر ادھر ادھر، اسٹیشن پر، اسٹیشن سے باہر، سڑکوں پر، میدانوں میں۔ دو ایک برے بھلے کیمپ قائم ہو چکے ہیں مگر نہ ان میں کھانے کا معقول انتظام ہے نہ سر چھپانے کو جگہ۔ لٹے کھسٹے خانماں برباد، مصیبت زدہ پردیسی مایوسی، بے بسی، غصے، صدمے اور جوشِ انتقام میں پاگل ہو رہے ہیں بدلے کی خواہش روز بروز بڑھ رہی ہے۔ فسادی اور بدباطن لوگ، غنڈے اور فرقہ وارانہ فساد کرانے اور منافرت پھیلانے والے خود غرض لوگ، پردیسیوں کے جذباتِ نفرت و آتشِ انتقام کو اور زیادہ ہوا دے کر بھڑکا رہے ہیں۔ سارے شہر میں بے اطمینانی، خوف و ہراس، بے چینی و اضطراب پھیلا ہوا ہے۔ اسٹیشن پر، محلوں میں، گلیوں میں چھرے بھونکنے کی وارداتیں، دو چار دس پانچ روز ہو رہی ہیں۔ شہر میں فساد کا اندیشہ بہت بڑھ گیا ہے۔ چند ذمہ دار اور عاقبت اندیش افراد کا ہوش اُڑا ہوا ہے اور وہ اپنی سی دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ مگر پولس اور فوج کا انتظام ناقص ہے اور اربابِ اقتدار اس خوش فہمی میں ہیں کہ کم سے کم دہلی میں کوئی بڑا جھگڑا نہیں ہو سکتا۔۔۔۔

مشرقی اور مغربی پنجاب میں قیامت بپا ہے اور وہاں کے اثرات دہلی پر پڑ رہے ہیں۔۔۔

شہر کی فضا روز بروز بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے ۔۔ ۔۔ افواہوں کا زور ہے۔ مگر دہلی کے اکثر بے فکرے، سادہ لوح، خوش فہم عوام اس خیال میں مگن ہیں کہ " ابھی ان شاء اللہ میاں گڑبڑ نہیں ہوگی "۔ وہ اس دھوکے میں ہیں کہ غدر کے بعد اب دہلی ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو چکی ۔۔ ۔۔ ۔۔ وہ دہلی کی صدیوں کی تاریخ بھول چکے ہیں ۔۔ ۔۔ اُس بد نصیب دہلی کی جو ہر انقلاب کے وقت ظلم و ستم کا نشانہ بنتی آئی ہے۔

قرول باغ کے ایک مختصر سے مکان میں ذکیہ، شاہدہ، صفیہ اور اکبری بیٹھی باتیں کر رہی ہیں۔

شاہدہ: آپا ستمبر کی بھی آج تین تاریخ ہو گئی۔ اب تک ہم کالج نہیں پہنچ سکے۔ کتنا ہرج ہو رہا ہے

اکبری: آخری سال ہے اور جانے میں اتنی دیر ہو رہی ہے۔ ایک تو باجی کے انگلستان جانے کی گڑبڑ میں چھٹیوں میں کام نہ ہو سکا۔ پھر ان کو پہنچانے بمبئی گئے اور وہاں سے اتنے دن بعد آنے اور اب یہاں آئے کتنے دن ہو گئے اور علی گڑھ نہیں جا سکے۔ بھئی اللہ ہم کیا کریں۔

ذکیہ: توبہ ایسی بھی کیا جلدی پڑی جانا۔ آج پانچواں ہی دن تو ہے تمہیں بمبئی سے آئے۔

صفیہ: نہیں آپا سچ تو ہے بہت دیر ہو گئی۔ اصل میں میرے بخار کی وجہ سے یہ سب ہوا۔ اگر پرسوں چلے گئے ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ اب شہر میں کرفیو لگ گیا اور دولہا بھائی بیچارے ٹھہرے ڈرپوک۔ بہانے کرتے رہتے ہیں کہ آج نہیں کل جانا کل نہیں پرسوں جانا۔

ذکیہ: وہ کہتے ہیں اسٹیشن پر جانا بہت خطرناک ہے۔

شاہدہ: جی ہاں خطرناک ہے!! خواہ مخواہ ـــــ یہ سب روکنے کے بہانے ہیں بھئی میں تو اپنا سامان باندھتی ہوں کوئی جانے یا نہ جائے میں تو کل صبح ضرور چلی جاؤنگی وہاں اماں جی سمجھ رہی ہوں گی کہ ہم کالج پہنچ بھی گئے۔ اماں کا، باجی کا، ماموں جان کا، سب کا وہاں خط آیا ہوگا۔

ذکیہ: یہ چھوٹی سب سے کھوٹی۔ بڑی بہادر ہیں اکیلی چلی جائیں گی۔

شاہدہ: تم سے تو زیادہ بہادر ہوں۔ جا کر دکھا دوں گی ـــــ آخر ڈر کس بات کا ہے

ذکیہ: بس صرف جان جانے کا ڈر ہے۔

صفیہ: اجی یہ سب بزدلی کی باتیں ہیں۔ آج تو سب سامان ٹھیک کر ہی لو۔ کل صبح ضرور جانا چاہیے۔ بھئی سامان اب کے بہت ہے۔

اکبری: بہت سا تو ہونا ہی تھا۔ اماں جی نے کتنا کہا کہ جاڑے گرمی کے بس کپڑے، سارے بستر، یہ اتنی بہت سی تصویریں۔ ڈبے آرائشی چیزیں نہ لے جاؤ، بے کار سامان بڑھاتی ہو مگر تم نے مانا ہی نہیں۔

شاہدہ: تو تم کب چھوڑ آئی ہو اپنی چیزیں اور کپڑے جو ہمیں کہہ رہی ہو۔ بھلا شوق اور پسند کے کپڑے کالج میں نہ پہنیں تو بنائیں ہی کیوں؟ وہاں کمروں میں تصویریں اور چیزیں نہ سجائیں تو کس کام کی۔

صفیہ: ارے بھئی ان سے سامان تھوڑا ہی بڑھا ہے۔ سب سے بڑا بوجھ تو کتابوں کا ہے۔ اتنا بڑا صندوق تینوں کی کتابوں سے بھر گیا ہے اور دو دو بکس ہر ایک کے کپڑوں کے ـــــ بھئی بڑا سامان ہے کیسے جائے گا۔ میرا تو جی گھبرا رہا ہے۔

ذکیہ: فکر کیوں کرتی ہو۔ سب چیزیں چلی جائیں گی۔ تم کوئی سر پہ تو لاد کر لے نہ

جاؤ گی۔

اکبری: پہلے ہی کیا سامان کم تھا کہ اب ہم لوگ بمبئی جاکر اور یہ اتنی ساڑھیاں، اتنے جوتے اور کیا کیا خرید لائے۔ اماں جی کے کتنے روپے خرچ کرا دئے۔

شاہدہ: عمر بھر کی تو آرزو تھی کہ کسی طرح بمبئی جانا ملے۔ اب وہاں سے دو چار چیزیں بھی نہ لاتے۔ اللہ باجی کو خوش رکھے اور خیر سے واپس لائے۔ انھوں نے اماں جی کو راضی بھی کر لیا کہ سب کو لے کر بمبئی چلو ورنہ اماں جی بھلا ہمیں لے جاتیں وہاں۔

اکبری: ذکیہ آپا تمھاری ساڑھیاں بہت عمدہ ہیں۔

ذکیہ: دو اچھی ہیں باقی تو معمولی ہی ہیں۔

صفیہ: میں تو اپنے بلاوس پر شیشے کا کام بناؤں گی۔

اکبری: اور میں اپنی جالی کی ساڑھی پر تار کشی کا۔ بڑا پیارا لگتا ہے۔

شاہدہ: جناب سب سے خوبصورت تو میرا قمیص ہوگا۔ تم سب دیکھ دیکھ جلو گی۔

صفیہ: جی ہاں۔۔ ۔۔ یہ سب ہوگا اور پڑھنا لکھنا نہیں ہوگا امتحان میں فیل ہو گئیں تو اماں اور ماموں جان کے تانے کون سنے گا۔

شاہدہ: تم۔

صفیہ، اکبری اور شاہدہ ذکیہ کی چھوٹی بہنیں تھیں اور اس کے ہاں چار پانچ دن سے آئی ہوئی تھیں۔ ذکیہ کی شادی کو ابھی دو ڈھائی سال ہوئے تھے۔ وہ بہت شوقین، خوش مذاق اور نفاست پسند لڑکی تھی۔ اس نے اپنا چھوٹا سا گھر خوبصورت فرنیچر، نفیس برتنوں اور حسین آرائشی چیزوں سے نہایت سلیقے اور نفاست سے سجا رکھا تھا۔ کشن، پردے، میز پوشیں سب خوبصورت اور نئی وضع کے، چینی کے برتنوں کے کئی سٹ کھانے کے کمرے میں سجے

ہوئے، چاندی کا خولصورت سامان۔ شیشے کی الماریوں میں اردو انگریزی کی بہترین کتابیں۔ ... نئی وضع کی سنگار میز پر آرائش اور سنگار کا سامان، ایک چھوٹی سی میز پر نیا خوبصورت ریڈیو سٹ۔ دوسری طرف سنگر مشین، غرض ضرورت اور خولصورتی کی کون سی چیز تھی جو اس چھوٹے سے فلیٹ میں موجود نہ ہو۔ صندوق اُس کے جہیز اور ابری کے قیمتی اور بھاری ملبوسات سے اور الماریاں اس کی پسند کی خریدی ہوئی خوبصورت اور دلاویز ساڑھیوں سے بھری پڑی تھیں۔ اُس کا گھر دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ تین ساڑھے تین سو روپے ماہوار کی آمدنی والے کا گھر ہے؟ ذکیہ کا شوق خبط کی حد کو پہنچ گیا تھا۔ تبھی تو اس نے اپنا اور میاں دونوں کا سارا روپیہ انھیں چیزوں پر صرف کر دیا تھا۔ بلکہ اور قرض لیکر بھی فرنیچر کی کمی پوری کی تھی۔ میاں کچھ خود شوقین کچھ نئی نویلی دلھن کی خوشی کی خاطر جو وہ کہے کرنے کو خوشی سے تیار ہو جاتے۔ اور کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ تھا، پھر بھلا ذکیہ اپنا شوق کیوں پورا نہ کرتی؟

کچھ دیر بعد ذکیہ کے دولھا سکندر آئے۔ تینوں سالیاں ان کے سر ہو گئیں۔ کہ ہم نہیں جانتے کسی طرح کل صبح ہمیں علی گڈھ روانہ کر دو۔ انھوں نے بہت کہا کہ شہر کی فضا ٹھیک نہیں۔ سفر کرنا خطرناک ہے مگر وہ نہ مانیں تو وعدہ کر لیا اچھا میں اپنا نوکر ساتھ کر دوں گا۔ کل چلی جانا۔

اگلے دن صبح اٹھتے ہی خبر ملی کہ چوبیس گھنٹے کا کرفیو قرول باغ میں اور کئی اور جگہ لگا ہوا ہے۔ رات میں بہت سی وارداتیں ہوئی ہیں۔ سکندر نے ذکیہ کے ماموں کو جو نئی دہلی میں رہتے تھے پڑوس کے گھر سے فون کیا کہ لڑکیاں آج علی گڈھ جانا چاہتی ہیں آپ کی کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا ہرگز نہ جانے دینا۔ جب امن ہو جائے گا تو میں

خود جا کر انھیں پہنچا دوں گا۔ لڑکیوں نے یہ سنا تو منھ چڑھ گئے۔ بہنوئی کی بہادری پر فقرے کسے، ماموں جان کی احتیاط کا مذاق اڑایا۔۔ ۔۔ ۔۔آج کل کے مردوں کی بزدلی اور لڑکیوں کی بہادری کے چرچے دن بھر رہے اور دن گزر گیا۔

پانچ کی صبح کو سکندر ناشتہ کے بعد ذرا پڑوس میں نکلے کہ حال احوال معلوم کریں۔ ذکیہ وغیرہ کے پاس نیچے کی منزل سے پڑوسنیں گھبرائی ہوئی آئیں اور کہا کہ آج قرول باغ میں بہت جھگڑا ہو رہا ہے۔۔ ۔۔ ۔۔سبزی منڈی، پہاڑ گنج وغیرہ میں بھی گڑبڑ ہے۔ اور گوردوارہ روڈ پر تو سنا ہے کہ باقاعدہ دو طرف سے گولیاں چل رہی ہیں، گھر جلائے جا رہے ہیں۔۔ ۔۔ ۔۔لوگ بھاگنا چاہتے ہیں تو بھاگ نہیں سکتے۔ پڑوسنوں کے چہرے خوف سے سفید تھے۔ لیکن تعلیم یافتہ نڈر اور نوجوان لڑکیوں نے ان قدامت پرست ڈرپوک بیویوں کو سمجھایا کہ آپ لوگ ذرا نہ گھبرائیں اور افواہوں پر یقین نہ کریں۔ یہاں انشاءاللہ کچھ نہیں ہوگا۔ انھوں نے کہا بیٹی تم لوگ بھی ہو ایسی بے فکر نہ بیٹھو۔ کہیں نکل جانے کی تدبیر کرو۔ ہم بھی سواری کا انتظام ہو جائے تو شہر جانا چاہ رہے ہیں۔

کچھ دیر سکندر گھبرائے ہوئے آئے۔ " ذکیہ —— ذکیہ —— ذرا ادھر آنا "

" کیا ہے۔۔ ۔۔ کیوں اس قدر گھبرائے ہوئے ہو؟ "

سکندر: قرول باغ میں آج سخت خطرہ ہے۔ گوردوارہ روڈ پر سخت لڑائی ہو رہی ہے۔ اس طرف بھی کئی گھر لوٹے جا چکے ہیں۔ جگہ جگہ آگ لگائی جا رہی ہے۔ بتاؤ ہم کیا کریں؟

ذکیہ: تم تو خواہ مخواہ گھبرا رہے ہو۔ آخر یہ اتنی فوج اور پولس ہے، یہ لوگوں کی حفاظت نہ کرے گی۔

سکندر: اجی یہ فوج اور پولس تو اور غضب ڈھا رہی ہے۔ بجائے فسادیوں کو روکنے کے اور ان کا ساتھ دے رہی ہے۔۔۔۔۔۔

ذکیہ: اف ــــ تمہاری عادت ہے کہ ہمیشہ افواہوں پر یقین کر لیتے ہو۔

سکندر: کیسی باتیں کرتی ہو۔ آج یہاں حالت بہت نازک ہے ذکیہ ــــ فوراً یہاں سے نکل چلنا چاہیے۔ میں اکیلا ہوتا تب تو خیر لیکن تمہارا اور تینوں بہنوں کا ساتھ ہے اس لیے بہت پریشان ہوں۔۔۔۔۔ میرے خیال میں ماموں جان کے ہاں چلیں۔ نئی دہلی ضرور محفوظ رہے گی۔

ذکیہ: کیوں یہاں جھگڑا ہو سکتا ہے تو وہاں نہیں ہو سکتا؟

سکندر: نہیں وہاں آج تک کبھی کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ وہاں انشاءاللہ امن رہے گا۔

ذکیہ: گھر اور سب سامان یہاں چھوڑ دیں؟

سکندر: اور کیا ہو سکتا ہے؟

ذکیہ: میرا ہزاروں کا سامان، برسوں کی محنت ــــ بھئی میں تو اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاتی تم چلے جاؤ۔

سکندر: سبحان اللہ۔ سامان کی خاطر جان دو گی؟ ہم نہ ہوئے تو اس سامان کو کیا کرنا ہے۔ زندہ رہے تو اور فراہم کر لیں گے۔ اس وقت تو جانیں بچانا پہلا فرض ہے تم جلدی سے ایک بکس میں چند ضروری کپڑے رکھ لو، میں جا کر ماموں جان کو فون کرتا ہوں کہ وہ کسی طرح کرفیو کا پاس لے کر ٹیکسی لے آئیں اور ہمیں یہاں سے نکالیں۔

سکندر فون کرنے گئے۔ ذکیہ نے بہنوں سے کہا۔ چاروں نے سکندر کو وہی

سمجھا مگر پھر بھی احتیاط کے طور پر جانے کے لئے تیار ہو گئیں۔ ایک سوٹ کیس میں چاروں نے اپنی قیمتی ساڑھیاں اور ذکیہ کے دو تین بہت بھاری جوڑے، اپنی پسندیدہ تصویریں اور دو چار کتابیں رکھ لیں۔ اور باقی سب سامان کوٹھریوں میں بند کر کے مضبوط قفل لگا دیتے۔ اور اپنے اپنے پرس گلے میں ڈال کر جانے کے لئے تیار ہو گئیں۔ نوجوانی کی عمر، بیسویں صدی کی پیدائش، باہمت اور نڈر لڑکیاں بہت بدحواس تو نہ تھیں مگر پھر بھی دل دھڑک رہے تھے۔ ذکیہ سب سے زیادہ اداس تھی۔ مگر چاروں کی یہ کوشش تھی کہ دوسروں کو انکی پریشانی کا علم نہ ہو۔ شور و غل کی آوازیں سن کر چاروں چھت پر چڑھ گئیں اور دیکھا کہ چپٹ فرلانگ کے فاصلے پر ہزاروں آدمیوں کا مجمع لوٹ مار کر رہا ہے اور کئی جگہ سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ اب حقیقت حال ان پر روشن ہوئی۔ چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں... سکندر نے اندر سے ڈانٹا کہ یہ کیا غضب کر رہی ہو، چھت پر سے فوراً نیچے اتر آؤ۔ پانچوں چپ چاپ زینے پر کھڑے عابد علی کا انتظار کرتے رہے۔ دو گھنٹے بعد عابد علی کسی نہ کسی طرح ایک ٹیکسی لے کر پہنچے ...... ذکیہ نے گھر کے ایک ایک صندوق، الماری، کوٹھری اور کمرے کو مضبوط قفل لگائے اور سب سے بڑا تالا گھر کے دروازے کو لگا کر اللہ کا نام لے اور سب کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گئی ...... لیکن بار بار مڑ مڑ کر گھر کو دیکھتی تھی اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اب پھر یہاں آنا نصیب نہ ہو گا۔

عابد علی نئی دہلی کے ایک کوارٹر میں رہتے تھے۔ بیوی بچے وطن میں تھے۔ ان کے کوارٹر کے برابر اور سامنے جتنے کوارٹر تھے سب کے سب ہندوؤں اور سکھوں کے تھے۔ اور بھی آس پاس ساٹھ ستر کوارٹر میں کوئی مسلمان نہ تھا۔ عابد علی کئی سال سے یہاں رہتے تھے۔ ان کے دوستوں اور عزیزوں نے بارہا کہا کہ کسی ایسے حصّے میں چلے جاؤ جہاں مسلمان زیادہ ہوں۔

یہاں رہنا ٹھیک نہیں، مگر انھوں نے ہمیشہ ہنس کر ٹال دیا۔ ایک تو شہر میں کہیں مکان ملنا ناممکن۔ دوسرے انھیں یہ یقین نہیں آتا تھا کہ دہلی میں ایسا جھگڑا ہو سکتا ہے کہ کوئی جگہ محفوظ نہ رہے خصوصاً نئی دہلی۔ پھر اپنے پڑوسیوں سے ان کے ہمیشہ اچھے تعلقات رہے تھے اور انھیں ان پر اعتماد تھا کہ وہ ان کی کم سے کم جاسوسی تو نہ کریں گے اب بھی جبکہ نئی دہلی کے تقریباً ۹۹ فیصدی مسلمان پاکستان جا چکے تھے۔ وہ اسی اطمینان سے اپنے گھر میں رہتے تھے۔ ان کے دوستوں اور ساتھیوں نے انھیں بہت کچھ کہا کہ وہ پاکستان کیوں نہیں جاتے، مگر عابد علی نے ہمیشہ یہی جواب دیا وطن پاکستان نہیں ہندوستان ہے، میں ہندوستان کی خدمت کروں گا اور یہیں رہوں گا۔ ...... پاکستان کیوں جاؤں؟

عابد علی نے بھانجیوں کو دلاسا دیا کہ اطمینان سے یہاں رہو۔ یہاں کوئی خطرہ نہیں لڑکیاں بھی مطمئن ہو گئیں۔ جوانی کی عمر، چیزوں کا افسوس یا آئندہ کا ہراس زیادہ دیر تک کیوں ستاتا؟ دن بھر تاش، کیرم وغیرہ ہوتا رہا۔ جب کھیل سے تھک گئیں تو بنے بیٹھ گئیں شام کو ماموں آ گئے، رات گئے تک سب کے سب گپ شپ کرتے رہے اور ۶ کا دن بھی یوں ہی کٹ گیا۔ چھ کی شام کو سکندر نے قرول باغ میں اپنے ایک ہندو دوست کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ سکندر کا اور ان کے آس پاس کے مسلمانوں کے سب مکان لوٹ لئے گئے۔ کچھ جلا دئے گئے ...... اور نہ صرف مکانات بلکہ ادبی ادارے بھی جلا دئے۔ لائبریری لوٹ لی، مسجدوں پر قبضہ کر لیا۔ سکندر کو سخت صدمہ ہوا۔ کچھ دیر تک سر پکڑے بیٹھا رہا۔ پہلے سوچا بیوی سے کچھ نہ کہے مگر آخر ضبط نہ ہوا بتا دیا۔ ذکیہ کے دل کو سخت دھکا لگا، مگر اس نے منھ سے اف نہ کی ...... سکندر اور

عابد علی اس کے حوصلے پر حیران رہ گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ذکیہ بس بار بار یہ کہتی تھی میرا گھر تو خیر لٹنا تھا لٹ گیا مگر میری بیچاری بہنوں کا کیا سب سامان خواہ مخواہ لٹ گیا۔ کاش یہ علی گڑھ چلی گئی ہوتیں۔۔ کیسے بچیوں کے کپڑے بستر، کورس کی کتابیں سبھی کچھ تو لٹ گیا، اماں کیا کہیں گی؟ انھیں کیسا قلق ہوگا؟ بہنیں کہتیں ذکیہ آپا تم بھی کمال کی ہو۔ ہمارا کیا ہے تمھارا تو ہزاروں کا گھر تھا۔ ۔ ۔ ۔ کاش ہمارا لٹ جاتا تمھارا بچ جاتا۔

سات کی صبح کو یہ سب لوگ ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ عابد علی نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا " ہلو ـــــ ہلو ـــــ کون ـــــ کرشن ـــــ ہاں، ـــــ ہاں ـــــ چاروں لڑکیاں اور سکندر میرے گھر آ گئے ہیں ـــــ کیا کہا ـــــ نئی دہلی میں جھگڑا ہو رہا ہے؟ اجی جاؤ بھی ـــــ گپ ہو گی ـــــ نہیں ـــــ تم خواہ مخواہ ڈرتے ہو ـــــ اچھا ـــــ خیر ـــــ تم کہتے ہو تو نہیں جاؤں گا ـــــ ہاں ہاں ـــــ اچھا گڈ بائی"

ذکیہ: ماموں جان کرشن صاحب کیا کہہ رہے تھے؟

عابد: کہتے ہیں آج دفتر نہ جاؤ نئی دہلی میں گڑبڑ ہے۔

صفیہ: اچھے ماموں جان پھر تو نہ جائیے گا۔

عابد: کرشن ڈرپوک اور وہمی ہے کوئی افواہ سن لی ہو گی۔

سکندر: نہیں صاحب احتیاط کرنی چاہئے آج آپ ہرگز نہ جائیے۔

عابد: ہاں نہیں جاؤں گا۔ کرشن نے کہا ہے کہ میں شام کو آ کر تم سب کو اپنے گھر لے جاؤں گا۔

ذکیہ: یا اللہ اب ان کے گھر جانا پڑے گا؟

عابد: اس نے احتیاطاً کہہ دیا ہے ورنہ مجھے امید ہے کہ یہاں کوئی ڈر نہیں تم اطمینان رکھو۔

عابد علی نے یہ کہہ کر شیو کیا اور اطمینان سے پلنگ پر لیٹ کر کتاب پڑھنے لگے۔ دفتر جانا تو تھا ہی نہیں۔ سکندر البتہ پریشان اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ لڑکیاں بھی متفکر سی تھیں۔

ساڑھے دس بجے کسی نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ عابد علی اُٹھ کر باہر گئے دیکھا ان کے پڑوسی "سردار جی" کھڑے ہیں۔ عابد علی کا ان سے زیادہ میل جول یا دوستی نہ تھی۔ ہاں آتے جاتے صاحب سلامت ہو جاتی تھی۔ ان کے ساتھ ان کے برابر کے کوارٹر کے "بابو جی" دھوتی پہنے کھڑے ہوئے تھے۔

عابد: آئیے سردار جی۔ کیسے تکلیف کی۔

سردار جی: عابدی صاحب۔ یہ تو آپ جانو ہو کہ آج کل سارے شہر میں گڑبڑ اور جھگڑا ہو رہا ہے۔ مگر آپ تو گھر میں موجود ہو۔ کچھ انتظام نہیں کیا۔

عابد: سردار جی یہاں کوئی خوف نہیں۔ پھر آپ ہی بتائیے گھر تو یہ ہے جاؤں کہاں؟

بابو جی: عابدی صاحب آپ بڑے بے فکر آدمی ہیں، کچھ خبر ہی نہیں رکھتے آج نئی دہلی میں بھی بہت لوٹ مار ہو رہی ہے۔ ابھی میرے نوکر نے آ کر بتایا، یہاں سے تھوڑی دور پر کئی مسلمانوں کے گھر لٹ چکے ہیں۔ کناٹ پلیس میں دوکانیں لٹ رہی ہیں۔ آپ کو جلدی اپنی حفاظت کا انتظام کرنا چاہیے۔

عابد: (متفکر ہوکر) میں اس وقت کیا کر سکتا ہوں۔ اور بابو جی کسی کو کیا خبر ہو گی کہ یہ گھر مسلمان کا ہے! دیکھئے میں نے تو اپنے نام کی تختی بھی اتار رکھی ہے۔

بابوجی: اجی آپ کیا سمجھ رہے ہیں؟ ان فسادی غنڈوں کے پاس ایک ایک مسلمان کے گھر کی فہرست موجود ہے۔ آپ بھولے آدمی کچھ نہیں جانتے۔

سردارجی: کیا گھر میں زنانیاں بھی ہیں جی؟

عابد: جی ہاں میری بھانجیاں ہیں۔

سردارجی: تو جی پھر آپ اس گھر میں نہ ٹھیرو —— آپ گھر بند کردو اور ہمارے کوارٹر میں آجاؤ جی۔ ہم کریں گے تمھاری حفاظت۔ کیوں بابوجی ٹھیک ہے نا؟

بابوجی: ہاں عابدی صاحب یہاں رہنا ٹھیک نہیں آپ اپنی لڑکیوں کو لے کر ہمارے کوارٹر میں آجائیے۔

سردارجی: فکر نہ کرنا عابدی صاحب، تمھاری لڑکیاں ہماری لڑکیاں ہیں ہم اپنی جان دے کر تمھیں اور انھیں بچائیں گے۔

عابد: یہ آپ کی عنایت ہے سردار صاحب۔

اندر جاکر عابد علی نے لڑکیوں سے سردارجی کی تجویز کا ذکر کیا اور لڑکیوں سے کہا تم گھبراؤ نہیں وہ محض احتیاطاً کہہ رہے ہیں۔ بھلا یہاں ... ... نئی دہلی میں دن دھاڑے لوٹ مار ہو سکتی ہے؟

سکندر: پھر بھی ہمیں ان لوگوں کی رائے مان لینی چاہیے۔ ان چاروں کو تو کم سے کم ان کے ہاں ضرور پہنچا دو ... ... آدمی تو شریف ہیں نا ماموں جی وہ؟

عابد: بظاہر تو شریف ہی معلوم ہوتے ہیں۔ ورنہ انھیں کیا غرض پڑی تھی

کہ ہمیں خطرے سے آگاہ کرنے آتے اور اپنے گھر میں چھپانے کو تیار ہو جاتے۔

سکندر: اس میں کچھ دھوکا نہ ہو؟ فسادیوں سے ملے ہوئے تو نہیں ہیں؟

عابد: نہیں ایسے نہیں معلوم ہوتے ـــــــ اور دل کا حال تو سوا خدا کے کوئی نہیں جانتا۔

سکندر: یہ سردار جی اور بابو جی بڈھے ہیں یا جوان؟

عابد: سردار جی تو بہت بڈھے ہیں اور بابو جی بھی میری ہم عمر ہوں گے...

سکندر: تو پھر مناسب یہ ہے کہ ہم لوگ بھی چلیں اور ان چاروں کو بھی لے چلیں۔ اٹھو ذکیہ اور تم تینوں بھی۔

ذکیہ: ماموں جان یہ اپنے کپڑوں کا سوٹ کیس بھی ان کے ہاں رکھوا دیں..... ایسا نہ ہو کہ بالکل ننگے ہی رہ جائیں۔

سکندر: عورتوں کی جان کپڑوں میں ہوتی ہے۔ سب سے پہلے ان کے بچانے کی فکر رہتی ہے۔

ذکیہ: تم مردوں کا کیا ہے تم تو آدھ گز کی لنگوٹی بھی باندھ کر پھر سکتے ہو۔ عورتیں تو ایسا نہیں کر سکتیں.. .. .. ان کے لئے تو تن ڈھانکنے کو کپڑا نہ ہو تو ڈوب مرنے کی جگہ ہے.. .. .. تمھیں اپنی جان زیادہ پیاری ہوتی ہے ہمیں اپنی عزت آبرو.. .. .. ..

سکندر: جی ہاں اور قیمتی ریشمی کپڑے جب ہوں تب تو... .. .. ..

عابد: ارے کیا خواہ مخواہ کی باتیں کر رہے ہو سکندر... ذکیہ بی بی تم ذرا نہ گھبراؤ۔ انشاءاللہ گھر محفوظ رہے گا۔ ہم قفل لگائے دیتے ہیں بکس لے جانے میں یہ

خطرہ ہے کہ پڑوس کے لوگ دیکھیں گے اور شاید مخبری ہی کر دیں۔ ہمارے ساتھ ان بچاروں کی بھی جان نہ خطرے میں پڑ جائے۔

شاہدہ: اچھا دو دو ساڑھیاں بغل میں مار لیں..... ذکیہ آپا بھئی میں تو اپنی وہ شانتی پورن ساڑھی ضرور لوں گی۔ ایک دفعہ بھی تو نہیں پہنی۔

سکندر: (جھلاکر) بھئی کیا حماقت کر رہی ہو جلدی کرو چلدو۔

عابد: ہاں بھئی جلدی کرو ــــ یہ کپڑے اتار دو اور سوتی ساڑھیاں پہن لو

چاروں بہنوں نے جلدی جلدی ساڑھیاں پہنیں اپنے اپنے بٹوے ہاتھ میں لٹکائے اور ذکیہ کے زیور کا صندوقچہ جس اٹیچی کیس میں تھا اسے ہاتھ میں لے لیا اور ایک ایک لڑکی کو عابد علی پچھواڑے کی طرف سے چپکے چپکے سردار جی کے یہاں پہنچا آئے خود اور سکندر بھی گھر میں قفل لگا کر آ گئے۔

سردار جی کے دوسرے ہندو سکھ پڑوسی بھی گھبرائے ہوئے تھے۔ شور و غل کی آوازیں آ رہی تھیں اور کسی کو اچھی طرح پتہ نہ تھا کہ یہ حملہ آور اور لوٹ مار کرنے والے ہیں کون؟ ہندو سکھ یا مسلمان یا دونوں؟ تین چار کوارٹروں کی عورتیں ایک بیچ کے کوارٹر میں جمع ہو گئی تھیں۔ برابر کے بابو جی کے کوارٹر میں چھ سات مرد جمع تھے، کرپانیں گلے میں لٹکائے، تلواریں لئے، کسی کسی کے پاس بندوق بھی تھی۔

سردار جی: اجی عابدی صاحب۔ آپ بھی غضب کرتے ہو۔ یہ کرتا پاجامہ اتار دو اور پتلون شلوار پہن لو ـــــــ اسے دیکھ کر تو دور ہی سے لوگ سمجھ لیں گے کہ تم مسلمان ہو۔

عابد علی نے سوچا کہ سردار جی محض خیر خواہ ہی نہیں عقلمند بھی ہیں.....

گھر گئے اور پتلون اور بش شرٹ پہن کر پھر سردار جی کے یہاں آگئے۔ جہاں سکندر سے بابو جی کھڑے باتیں کر رہے تھے " بابو صاحب آپ سوٹ پہنے بالکل ہندو سے لگ رہے ہیں ـــــ آپ کو یہاں کوئی جانتا بھی نہیں۔ آپ اطمینان سے یہاں ٹھہرئیے کوئی پوچھے تو کہہ دینا بابو جگندر کا بھائی ہوں کل ہی بنگال سے آیا ہوں ـــــ نام بشمبھر ناتھ بتا دینا۔"

سکندر (مسکرا کر) سکندر اور بشمبھر ملتا ہی ہے۔

عابد: اچھا بشمبھر ناتھ جی آپ تو بے فکری سے ٹھہرئیے۔

سردار جی: پر عابدی صاحب آپ کا یوں کھڑا ہونا ٹھیک نہیں ...... آپ کو یہاں سب جانیں ہیں۔

عابد: نہیں سردار جی کوئی فکر کی بات نہیں۔

عابد علی سردار جی سے موجودہ جھگڑے کے بارے میں باتیں کرنے لگے اور سکندر سامنے لان پر ادھر اُدھر گھومنے لگے ...... سردار جی کے گھر سے ایک نوجوان باہر نکلا جو کچھ دیر عابد علی کے پاس کھڑا رہا۔ پھر جا کر کچھ دور کھڑے ہوئے ہندو پڑوسیوں سے باتیں کرنے لگا۔ سردار جی اُس نوجوان کی طرف دیکھ کر عابد علی سے کہہ رہے تھے " ابھی اس کی جان سخت خطرے میں تھی ـــــ یہ لڑکا ہے میرا ـــــ لاہور میں تھا ..... وہاں گھر گیا تھا دس بیس غنڈے بدمعاشوں میں ـــــ سب کے سب اسے مارنے پر تل گئے تھے ...... پر اس کے دوست فضل نے اسے بچا لیا ـــــ بڑا شریف لڑکا تھا ـــــ سچا سورما ـــــ دوست کی خاطر اپنوں سے لڑ گیا ..... کہا میرے جیتے جی تم اسے ہاتھ نہیں لگا سکتے ـــــ ابھی اُس بہادر نے جان پر کھیل کر ا۔

حفاظت کی جگہ پہنچا دیا۔۔۔۔۔ اور خود بیچارا مارا گیا۔۔۔۔۔ اُن غنڈوں نے اُسے بھی نہ چھوڑا ـــــــ مسلمان کو ـــــــ"

عابد: سردار جی یہ ہندو مسلمان اور سکھ کی لڑائی نہیں یہ تو درندوں اور وحشیوں کی جنگ ہے۔۔۔۔ مذہب کا نام لے کر اُسے بدنام کرنا ہے ـــــ دنیا کا کونسا مذہب ہے جس نے اس ظلم و فساد کی، اس قتل و خون کی اجازت دی ہو؟ کون سا مذہب ہے جو ہم وطنوں کو لڑنا سکھاتا ہے۔۔۔۔۔ یہ تو زبردست کی زیردست سے لڑائی ہے ـــــ ظالم کی مظلوم سے ـــــ حیوانیت کی انسانیت سے ـــــ لڑائی ہے۔"

سردار جی: سچ کہتے ہو جی ـــــ یہ انسان نہیں وحشی ہیں۔

عابد: اجی درندے ہیں خونخوار درندے ـــــ بلکہ ان سے بدتر ـــــ وہ بھی تو آپس میں اس طرح نہیں لڑتے۔

نوجوان سردار اندر سے ہاتھ میں ایک چمکدار چھرا لئے ہوئے نکلا۔ اور برآمدے میں عابد علی کے پاس آکر آہستہ سے بولا "عابدی صاحب ذرا اندر آئیے" یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا اور عابد چھرے کی چمک اور اس کے طرزِ کلام سے کچھ ٹھٹکے۔۔۔ اور سوچ میں پڑ گئے کہ اندر جائیں یا نہ جائیں۔ نوجوان نے پھر اشارے سے انہیں بلایا۔۔۔۔ عابد علی بہت گھبرائے، ابھی تو یہ سب کے سب بڑی دوستانہ باتیں کر رہے تھے ـــــ خود سردار جی اور یہ نوجوان بھی ـــــ خود اصرار کر کے ہمیں گھر سے لے کر آئے اور اب یہ لڑکا تلوار ہاتھ میں لئے اندر بلا رہا ہے ـــــ کیا قصد ہے، کیا لاہور کا بدلہ تو نہیں چکانا چاہتے؟ ـــــ اُن کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

اور انھوں نے بڈھے سردار جی کی طرف دیکھا وہ بے پروائی سے بولے "اندر چلے جاؤ عابدی صاحب کوئی فکر نہیں"۔ عابد علی نے ہمت باندھی اور کمرے کے اندر چلے گئے مگر نوجوان وہاں سے دوسرے کمرے اندر چلا گیا اور بولا "اور اندر آیئے اندر"۔ عابد کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں "کیا اس طرح دھوکے سے مارنا چاہتے ہیں؟ میرا تو خیر کچھ نہیں مگر میری لڑکیاں ——— اُف ——— وہ بھی تو ان کے قبضہ میں ہیں ——— کسی طرح سکندر ہی کو آگاہ کردوں کہ کسی تدبیر سے لڑکیوں کو نکال لے جائے ... انھوں نے دل مضبوط کیا اور بولے "سردار میری لڑکیاں ہیں ذرا میں ان سے ملنا چاہتا ہوں"۔ سردار نے پھر انھیں اشارے سے اندر کی طرف بلایا اور سرگوشی کے انداز میں بولا "لڑکیوں کی فکر نہ کرو بابو صاحب ——— وہ اچھی طرح ہیں ——— اپنی فکر کرو ——— اور عابد علی کا ہاتھ پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا ———

عابد علی نے دل ہی دل میں کلمہ طیب پڑھا اور آنکھیں بند کرکے خدا کا دھیان کرنے لگے ... ان کے کان میں آواز آئی "عابدی صاحب اِسے اپنے پاس رکھو۔ کوئی حملہ کرے تو تم اس سے اپنا بچاؤ کرسکتے ہو"۔ انھوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا نوجوان چھرا ان کی طرف بڑھائے کھڑا تھا ——— انھوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ——— ارے وہ کیا سمجھ رہا تھا اور یہ کیا کہہ رہا ہے؟ اس نے انھیں حیرت زدہ دیکھ کر کہا "اجی آپ باہر نہ کھڑے ہوں یہاں اندر بیٹھیں۔ سب کواٹر والے آپ کو جانتے ہیں جانے کون دوست ہے کون دشمن۔ اور یہ تلوار اپنے ہاتھ میں رکھیئے۔ یوں تو ہم آپ کی جان بچائیں گے ——— کوئی آپ کو مارنے آئے تو پہلے خود مریں گے تب آپ تک کوئی آسکے گا۔ ——— مگر آپ یہ چھرا ابھی

پاس رکھئے۔ ہتھیار پاس ہونے سے مرد کی ہمت بڑھی رہتی ہے۔

عابد (جن کا سر سردار جی کی شرافت کے سامنے جھکا جا رہا تھا) سردار جی میں آپ کا شکریہ نہیں ادا کر سکتا۔ مگر یہ تلوار میرے کسی کام کی نہیں۔ میں تو آدمی کیا کسی جانور کو بھی نہیں مار سکتا۔ مجھے تو لاٹھی تک چلانی نہیں آتی۔

سردار جی: اجی یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ جب اپنی جان پر بن جائے تو پھر آدمی سب کچھ کر گزرتا ہے جی۔

عابد: سچ کہتا ہوں سردار جی، مجھے تو کوئی مارنے آئے گا تب بھی اُسے نہیں مار سکتا۔ کسی انسان کی جان لینے کے لئے میرا ہاتھ اُٹھ ہی نہیں سکتا۔ چاہے وہ میرا دشمن ہی ہو۔ میں دوسروں کے لئے اپنی جان دے سکتا ہوں پر کسی کی جان لے نہیں سکتا۔

بڈھے سردار جی (جو اندر آ گئے تھے) آدمی تو بہت دیکھے پر عابدی صاحب آپ سا شریف آدمی ہم نے نہیں دیکھا ——— عابدی صاحب، ہم آپ کی اور آپ کی بچیوں کی جان اپنی جان دے کر بچائیں گے آپ ذرا فکر نہ کرو۔

بڈھے سردار جی کی بیوی سردارنی اندر آئیں تو انھوں نے کہا "دیکھو جی یہ ہمارے پڑوسی ہیں عابدی صاحب —— بچارے کا گھر خطرہ میں ہے، میں انھیں اور ان کی لڑکیوں کو لے آیا ہوں۔ انھیں چائے وائے پلاؤ اور ان کی لڑکیوں کو بھی"

سردارنی نے آ کر عابد علی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور جھگڑا فساد کرنے والوں کو برا بھلا کہنے لگیں ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ پھر لِلکر چائے مٹھائی وغیرہ ان کے سامنے رکھی اور اصرار کر کر کے انھیں کھلائی۔ سکندر کو بھی باہر سے بلا کر ناشتہ کرایا گیا اور باوجود پریشانی کے دونوں نے ڈٹ

کر کھایا۔ شاید جوانی میں پریشانی بھوک کو اور بڑھا دیتی ہے۔

ذکیہ صفیہ وغیرہ کا دوسرے کواٹر میں چند بڈھی جوان عورتوں نے سواگت کیا۔ کچھ دیر تو یہ چاروں چپ چاپ، پریشان اور جھیپی جھیپی سی بیٹھی رہیں مگر تھوڑی دیر بعد بابوجی کی لڑکی چمپا اور سردار جی کی بہو شام کور سے دوستی سی ہوگئی اور یہ ان سے بے تکلف باتیں کرنے لگیں۔ کچھ دیر بعد بڈھی سردارنی مٹھائی اور پھل اور چائے لئے ہوئے آئیں اور اپنی بہو اور چمپا سے کہا کہ "چھوریوں کو اچھی طرح کھلاؤ" اور خود پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں

سردارنی: عابدی صاحب تمھارے باپ ہیں کیا؟

ذکیہ: ہمارے ماموں ہیں۔

سردارنی: اچھا ا ا ہیں —— تم یہاں اکیلی ہو۔ ماں باپ کہاں ہیں۔

ذکیہ: میری اماں تو بمبئی میں دوسرے ماموں کے پاس ہیں۔ میرا گھر قرول باغ میں تھا۔ ہم چاروں چار پانچ دن ہوئے بمبئی سے واپس آئے تھے۔ میری ان بہنوں کو کالج جانا تھا کہ پرسوں قرول باغ میں جھگڑا ہوا۔ ہمارے ماموں ہمیں وہاں سے بمشکل نکال لائے اور ہمارا گھر وہاں لٹ لٹا گیا۔

چمپا: ہے ہے بہن جی تمھارا گھر سب کا سب لوٹ لیا —— سارا سامان

ذکیہ: ہاں بہن۔

شام کور: جانے یہ فسادی غنڈے کیسے ہوتے ہیں۔ خواہ مخواہ بے قصور لوگوں کو ستانا کس نے بتایا ہے۔

پملا (ایک اور کواٹر کی عورت) ویسٹ پنجاب میں ہمارے ہندو سکھوں پر بھی تو

مصیبت ہے ان پر بھی ظلم ہو رہا ہے ـــــ اور یہاں کیا مسلمان جھگڑا نہیں کر رہے سب نے ہتھیار جمع کر رکھے ہیں ہندوؤں کو مارنے کے لئے ...... سمجھتے ہیں کہ ہندو ہم سے ڈر جائیں گے ..... گیا وہ زمانہ جب ہندو ڈرتے ہوں گے ..... اب آخر کیوں ڈریں ۔ وہ جائیں اپنے پاکستان ہمارا ہندوستان ہمارے لئے چھوڑ دیں ہم انھیں مار کر نکال دیں گے۔

چمپا: کیسی باتیں کرتی ہو بملا بھابی ـــــ ملک بھی بانٹا جاتا ہے بھلا اجی ہندوستان کیا صرف ہندوؤں کا ہے مسلمانوں کا نہیں ..... ویسٹ پنجاب میں اگر ظلم ہو رہا ہے تو وہ وہاں والے کر رہے ہیں اُس کا بدلہ یہاں کے بے گناہوں سے کیا۔

ذکیہ: جو بھی ظلم کرے ہم اُسے برا سمجھتے ہیں چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان یا سکھ ـــــ پاکستان میں جو لوگ لوٹ مار قتل و غارت کر رہے ہیں ہم تو انھیں بھی اتنا ہی برا کہتے ہیں بلکہ اور زیادہ ـــــ مسلمان کا کام مظلوم کی مدد کرنا ہے نہ کہ ظلم توڑنا، جو مسلمان ایسا کرے وہ ہرگز مسلمان نہیں .. .. انسان بھی نہیں وہ تو وحشی ہے درندہ ہے ـــــ اپنے مذہب کا نام بدنام کرنے والا۔

سردارنی: سچ کہتی ہے بیٹی ۔ سب مسلمان برے نہیں ہوتے ـــــ سب سکھ ہندو بھی برے یا سب اچھے نہیں ہوتے ـــــ اب دیکھو میرے ہرنام کی جان اس کے مسلمان دوست نے اپنی جان دے کر بچائی ـــــ کیا ہم اس کی قوم کو بھی برا کہہ سکتے ہیں؟

بملا: خیر دو چار اچھے آدمی نکل آنے سے پوری قوم کے ظلم وستم تو دب نہیں سکتے۔

شام کور: اور یہ تمھاری قوم ظلم وستم نہیں کر رہی ہے؟ ویسٹ پنجاب میں ظلم

ہو رہا ہے تو ایسٹ پنجاب کیا بچا ہوا ہے۔

بملا: جو ویسٹ میں ہو رہا ہے ایسٹ میں اس کا جواب ہے ـــــ سنا نہیں تم نے راولپنڈی میں ہندو عورتوں کو ننگا پھرایا گیا ـــــ میرے تو سن کر آگ لگ جاتی ہے آگ۔

چمپا: اور امرتسر میں کیا یہی نہیں ہوا؟ وہاں مسلمان عورتوں کو اسی طرح ہزاروں آدمیوں میں ننگا کر کے پھرایا گیا اسے سن کر تمھارے دل میں آگ نہیں لگتی۔

صفیہ: میں تو خیال ہی نہیں کر سکتی کہ دنیا میں ایسے وحشی درندے بھی ہو سکتے ہیں...... اُف کیا ہو گیا ہے ہماری قوم کو۔

بملا: یہ سب مسلمانوں کے کرتوت ہیں۔ ـــــ انھوں نے پاکستان بنا کر یہ خون خرابا کیا ہے۔

سردارنی: بیٹی کسی ایک کا قصور نہیں.. دونوں نے نفرت پھیلائی دونوں نے جھگڑا کیا ـــــ دونوں نے ظلم کیا۔ کسی ایک پر الزام کیوں دو ـــــ اب دیکھو ان بچاری بچیوں کا گھر لٹ گیا ان کا بھلا کیا قصور تھا۔

چمپا اور شام کور نے اصرار کر کے اِن چاروں کو چائے وغیرہ پلائی اور بملا ناراض سی ہو کر اپنے کوارٹر میں چلی گئی۔

ساڑھے تین بجے آٹھ دس فسادیوں کی ایک ٹولی سامنے سے آتی نظر آئی۔ سردارنی جی نے اپنے کوارٹر کے دروازے اندر سے بند کر لینے کا حکم دیا اور سب گھروں کے مرد اپنے اپنے کوارٹر کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ فسادی عابد علی کے گھر کی طرف بڑھے

مگر بڑے سردار جی اور بابو جی نے ان سے کہا اس گھر کے لوگ تو کئی دن ہوئے یہاں سے جا چکے اور گھر پر ہم نے قبضہ کر لیا ہے۔ اب یہ ہمارا ہے اسے لوٹنے کا تمھیں کوئی حق نہیں۔ غنڈوں نے بہت بری بری نظروں سے سردار جی اور ان کے ساتھیوں کو گھورا مگر کئی جوانوں کے ہاتھ میں کرپانیں اور تلواریں دیکھیں تو وہ چپ چاپ واپس چلے گئے مگر کچھ دیر بعد دوسرا گروہ ـــــ پھر تیسرا گروہ آیا اور ان لوگوں کے سمجھانے بجھانے پر مرنے مارنے پر تیار ہو گیا ۔۔۔۔ یہ لوگ خود مسلمانوں سے ملے ہوئے ہیں ۔۔۔ ان کا بھی قصہ ختم کر دینا چاہیے ـــــ چھ بجے کے قریب سو کے قریب فسادی غنڈے عابد علی کے گھر کے سامنے جمع تھے اور قفل توڑ رہے تھے۔

عابد علی اندر کمرے میں بند باہر کے ہنگامے کو سن رہے تھے کہ بڑے سردار جی نے آ کر کہا "عابدی صاحب کیا کہیں آپ کا گھر بچانے کی بہت کوشش کی مگر بدمعاش مانتے ہی نہیں!" عابد علی نے حزیں مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا "سردار جی آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اپنی شرافت کا ثبوت دے دیا۔ یہی بہت کافی ہے ۔۔۔۔ اب ان فسادیوں کو زیادہ نہ روکیے ورنہ آپ خطرہ میں پڑ جائیں گے۔"

اتنے میں سردار جی کے بیٹے نے اندر آ کر کہا "جی وہ کئی بدمعاش کہہ رہے ہیں کہ سردار جی کے گھر کی تلاشی لو معلوم ہوتا ہے انھوں نے مسلمانوں کو چھپا رکھا ہے۔"

سردار جی (سینے پر ہاتھ مار کر) کس کی ہمت ہے کہ جگت سنگھ کے گھر میں اس کے مہمان کو ہاتھ بھی لگائے ـــــ خون کی ندیاں بہ جائیں گی ندیاں ـــــ

ہرنام سنگھ: اجی کیا طاقت ہے ان کی کہ میرے گھر میں عابدی صاحب کو کچھ کہہ سکیں ـــــ دس پانچ کو تو میں ہی ٹھکانے لگا دوں گا۔

عابد: سردار جی آپ لوگ اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالیے۔ ان لوگوں کو اپنا کام کرنے دیجیے ـــــ آپ کی شرافت نے مجھے آپ کی پوری قوم سے نفرت کرنے سے بچالیا ـــــ میں تعصب اور انتقام کے جذبہ کا شکار ہونے سے بچ گیا اور اسے میں بہت بڑی بات سمجھتا ہوں.....

سردار جی: اجی کیا کیا ہم نے۔ آپ کا گھر تک نہ بچا سکے!

دوسرے کواٹر میں عورتیں گھبرائی ہوئی پریشان، شیشوں میں سے لوٹ مار کرنے والوں کو دیکھ اور کوس رہی تھیں۔ چمپا نے ذکیہ، صفیہ، اکبری اور شاہدہ چاروں کو اندر کے کمرے میں لے جاکر ساڑھیاں الٹا پلٹا کر ہندوانی وضع کی کردیں۔ ماتھے پر سرخ بندیاں لگائیں اور بالکل ہندو لڑکیاں بنا دیا۔ اس کے بعد یہ چاروں بھی جاکر شیشوں میں سے اپنے گھر کو لٹتا ہوا دیکھنے لگیں

پچاس ساٹھ فسادی غنڈوں کے علاوہ آس پاس کے مہتر، کواٹروں کے نوکر۔ اور اکثر کواٹروں کے بابو حضرات بھی لوٹ مار میں شریک ہوگئے۔ عابد علی کا پندرہ برس کا جماجمایا گھر گھنٹہ بھر میں صاف ہوگیا۔ کتابوں سے بھری ہوئی الماریاں، کپڑوں سے بھرے بکس اور الماریاں، برتنوں کے دسیوں سٹ، پردے اور کشن تصویریں اور آرائشی چیزیں غرض جو جس کے ہاتھ آتا گیا وہ لے کر اطمینان سے چلا جاتا تھا۔ بڑے بڑے صوفے اور بھاری کرسیاں، میزیں اور تخت کئی کئی آدمی لگوا کر لے جا رہے تھے........

عابد علی کا تنکا تنکا جوڑ کر بنایا ہوا آشیانہ منٹوں میں لٹ کھسٹ کر ختم ہوگیا۔ سردار جی ان کے بیٹے اور بابوجی نے جب دیکھا کہ لوٹنے والے محض فسادی اور نچلے طبقے کے لوگ ہی نہیں بلکہ کئی سوٹ بوٹ میں ملبوس حضرات بھی ہیں اور خود ان کے پڑوسی بھی تو وہ بھی

جاکران میں شامل ہو گئے اور عابد علی کے کچھ کپڑے، کچھ تصویریں، کچھ کاغذات اور ایک اٹیچی کیس لوٹ کر لے آئے اور عابد علی کے سامنے ڈال دئے۔

ذکیہ اور اس کی بہنیں بڑی ہمت اور حوصلے سے اس کٹھن وقت کو برداشت کر رہی تھیں۔ سامنے دس ہزار کی مالیت کا سجا سجایا بنا بنایا گھر لٹ رہا تھا اور ان کا ذاتی سامان بھی۔ ان کے تن پر ایک جوڑے کے سوا کچھ نہ تھا جان کا خوف اعزت کا ڈر دل کو سہمائے دیتا تھا۔ مگر وہ استقلال کے ساتھ دل کو مضبوط کئے خاموش یہ سب دیکھ اور دل ہی دل میں دعائیں کر رہی تھیں۔ ان کی میزبان عورتیں بڑھی سردارنی، چمپا اور شام کور بار بار آکر ان کو تسلی دیتیں اور لوٹ مار کرنے والوں کو برا بھلا کہہ رہی تھیں۔

یہ سب کی سب دروازے کے پاس کھڑی تھیں کہ ایک نوجوان ذکیہ کے سوٹ کیس کو ہاتھ میں لئے گھر سے نکلا...... شاہدہ نے ذکیہ کو دیکھ کر کہا "ذکیہ آپا وہ دیکھو ہمارا سوٹ کیس"۔ ذکیہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "چپ رہو بی بی" اتنے میں وہ شخص اس کے کواٹر کے سامنے سے نکلا تو چمپا لپک کر کمرے سے نکلی اور جاکر اس کا ہاتھ پکڑ لیا "چھوڑ اس بکس کو یہ تو میں لوں گی ـــــ سارا گھر تم لوگوں نے لوٹ لیا، ہمارے حصے میں کچھ نہیں آیا"۔ اس نے چمپا کو جھٹک کر ہٹایا "ہٹ پرے تو کون لینے والی یہ تو میں لایا ہوں"۔ چمپا نے سوٹ کیس کا ہنڈل پکڑ لیا اور زور آزمائی کرنے لگی۔ سوٹ کیس کا قفل کھل گیا اور اندر سے بنارسی اور ریشمی کپڑے نظر آنے لگے، نوجوان نے چمپا کو دھکا دے کر کہا "واہ اس میں تو بڑے اچھے اچھے کپڑے ہیں یہ تو میں اپنی بیوی کو دوں گا، بچاری نے کبھی ریشمی ساڑھی نہیں پہنی"۔ چمپا دھکے سے دور جاکر گری مگر گرتے گرتے اس نے سوٹ کیس میں سے نکلے ہوئے ایک ریشمی کپڑے کو پکڑ کر کھینچ لیا

نوجوان آگے بڑھ گیا اور چمپا ہاتھ میں ذکیہ کا بنارسی دوپٹہ لئے ہوئے اندر آئی اور خوش ہو کر بولی " بہن جی دیکھو یہ کپڑا میں بچا لائی ——— میں تو تمہارا پورا بکس اس سے چھین رہی تھی مگر وہ بدمعاش مجھے دھکا دے کر بھاگ گیا "۔ ذکیہ نے اپنا بنارسی دوپٹہ دیکھا تو اس کے دل پر چوٹ لگی مگر چمپا کی بات پر ہنسی آ گئی کہ اپنے نزدیک بڑا کام کیا کہ ایک دوپٹہ بچا لائی۔

عابد علی بڑے دیر سے اس کوشش میں تھے کہ یہاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر کریں۔ سردار جی اور بابو جی نے بھی ان سے کہا کہ آپ کا یہاں زیادہ ٹھیرنا خطرناک ہے۔ جب فسادی سب چلے گئے تو نمبر (سکندر) سے انھوں نے کرشن کو فون کرایا۔ کرشن دو گھنٹے کی کوشش کے بعد ایک فوجی ٹرک لے کر عابد علی کو یہاں سے نکالنے کیلئے آ سکے۔

رات کے آٹھ بجے عابد علی، سکندر اور چاروں لڑکیاں اپنے میزبانوں کا شکریہ ادا کر کے، بیک بینی دو گوش، خالی ہاتھ جا کر ٹرک میں بیٹھ گئے۔ نہ بستر نہ کپڑے، نہ پیسہ نہ اور کوئی ضرورت کا سامان ——— وہ سب تو مجاہدوں، سورماؤں کے قبضے میں جا چکا تھا ——— ٹرک عابد علی کے والد کے ایک دوست نے جو حکومت ہند کے بہت بڑے عہدے دار تھے بھجوائی تھی اور یہ لوگ انھی کے یہاں جا رہے تھے کہ شاید فوجی پہرے کے باعث ان کا گھر محفوظ رہے۔

رات کی تاریکی بڑھتی جا رہی تھی ——— عابد علی اپنے ہونٹوں کو دانتوں دبائے، ماتھے پر شکن، آئندہ کے خیال سے پریشان ایک طرف خاموش بیٹھے جانے کیا سوچ رہے تھے۔ دوسری طرف سکندر سر جھکائے کسی فکر میں محو تھے۔ چاروں لڑکیاں چپ چاپ بیٹھی اپنے گھروں اور چیزوں کے لٹنے کے غم کو بھولے ان خوفناک مناظر کو بھی

ہوئی دیکھ رہی تھیں جو نظروں کے سامنے سے گزر رہے تھے .....
کہیں دکانیں لٹ رہی تھیں ـــــ کہیں آگ کے شعلے بلند تھے ـــــ
کبھی گولیوں کی آواز کانوں کے پردے چیرتی ہوئی سنائی دیتی تھی ـــــ ایک جگہ ایک تانگے کو چھ سات آدمی گھیرے تانگے والے کو مار رہے تھے ـــــ سڑکوں پر، مکانوں کے سامنے بیسیوں لاشیں الٹی، سیدھی پڑی ہوئی تھیں ـــــ ان کی گردنوں اور زخموں کے خون سے آس پاس کی زمین رنگین تھی ـــــ ان کی بے نور آنکھیں آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں کو گھور رہی تھیں اور بے گناہ مقتولوں کی روحیں بارگاہ الٰہی میں فریاد رس تھیں کہ کس قصور پر انھیں یہ مظالم سہنے پڑے ـــــ اور ایک نڈر اور گستاخ نوجوان کی روح پوچھ رہی تھی کہ اے رب العالمین ؎

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا؟
یہی شہ کار ہے تیرے ہنر کا؟

جسے اللہ رکھے

"اری بی سنتی ہو؟ ذرا میرا سامان درست کردو ـــــ میں کل صبح شملے جا رہا ہوں"۔

"اوئی خدا خیر کرے۔ یہ ایکدم شملے جانے کی کیا سوجھی اور پھر کل صبح ہی اب کون سا وقت ہے سامان ٹھیک کرنے کا شام تو ہو چکی"۔

"نہ کرنا چاہو تو صاف انکار کردو۔ بہانے کیوں بناتی ہو۔ میں خود ٹھیک کرلوں گا"۔

"بہانے کیا بناتی ہوں؟ دو دن پہلے کہہ دیتے تو کون سا غضب ہو جاتا۔ مگر تمھاری تو عادت ہے عین وقت پر پریشان کرنے کی۔ اب کس وقت ناشتہ پکے گا۔ کب دھوبی کے ہاں سے کپڑے آئیں گے......"

"ساجدہ تمھاری ماں تو میرا کام کرنا نہیں چاہتیں۔ تکلیف نہ ہو تو تم ہی میرا سامان درست کردو"۔

"ابا جی آج کل تو پنجاب کی طرف جانا بہت خطرناک ہے آپ اُدھر کیوں جا رہے ہیں اگر جانا ہی ہے تو کہیں اور چلے جائیے"۔

"معلوم ہوتا ہے تمھارا جی بھی میرا کام کرنے کو نہیں چاہتا"۔

"اباجی میں ابھی آپ کا سامان ٹھیک کر دوں گی، مگر یہ ضرور کہوں گی کہ اس وقت آپ کا جانا ٹھیک نہیں۔ روز روز سفر ——— کچھ دن تو گھر پر اطمینان سے رہا کیجئے۔"

"گھر پر تمہارے اباکا جی لگتا ہی کب ہے۔"

"ہاں تم تو چاہتی ہو کہ چند دن بھی مجھے آرام و سکون نہ ملے اسی طرح کام کرتے کرتے، لوگوں کے ہاتھوں پریشان ہوتے ہوتے مر جاؤں۔"

"اباجی آرام لینا چاہتے ہیں تو پھر چچا میاں اورنگ آباد بلا رہے ہیں وہاں چلے جائیے یا پھر ماموں جان کے ہاں پونا، وہاں کی تو آب و ہوا بھی سنا بہت اچھی ہے۔"

"آخر شملے کیوں نہ جاؤں ——— تم لوگ کیوں خواہ مخواہ میرے معاملات میں دخل دیتے ہو۔ میں جو مناسب سمجھوں گا کروں گا۔"

"جو تمہارا جی چاہے کرو۔ میں نے کب تمہاری بات میں دخل دیا ہے۔"

"اباجی ہم تو دخل نہیں دیتے۔ مگر جی ڈرتا ہے کہ راستے محفوظ نہیں"

"بڑے شرم کی بات ہے کہ ڈرتی ہو۔ میری لڑکی اور ایسی ڈرپوک؟"

باہر سے دستک کی آواز آئی ماسٹر شبیر حسین اٹھ کر باہر گئے وہاں ان کے دوست مصطفےٰ صاحب کھڑے تھے۔

"کہئے مصطفےٰ صاحب کیا خبریں ہیں؟"

"ماسٹر صاحب سیٹ میں نے کرا دی۔ سب انتظام ہو گیا مگر ایک بات میں کہنا چاہتا ہوں۔"

"کہیے"

"سب یہ کہہ رہے ہیں کہ آج کل آپ کو پنجاب کی طرف کا سفر کرنا نہیں چاہیے۔ مشرقی اور مغربی پنجاب میں جو قیامت برپا ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں گاڑیاں روک کر مسافروں کو مار دیا جاتا ہے۔ اس طرف مسلمانوں کی جان خطرے میں ہے۔ اُس طرف ہندو سکھوں کے ساتھ یہی سب ہو رہا ہے۔ اس وقت اس طرف جانا خطرناک ہے شبیر صاحب۔"

"سبحان اللہ پہلے آپ مُصر تھے کہ جاؤ جاؤ اور اب روک رہے ہیں۔ سیٹ رزرو ہوگئی، جانے کا ارادہ خدا خدا کر کے پکا ہوا۔ اب اس میں رکاوٹ نہ ڈالیئے۔ خدا کا نام لے کر چلا جانا ہی ٹھیک ہے۔"

"مگر شبیر صاحب ——————"

"اجی اگر مگر کچھ نہیں۔ جھوٹی خبروں اور افواہوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے ——— خدا نے چاہا تو کچھ نہیں ہوگا میں بخیریت پہنچ جاؤں گا ——— ساجدہ اور اس کی ماں نے بھی کچھ الٹی سلٹی خبریں سن لی ہیں وہ بھی روک رہی ہیں۔"

"تب تو ہرگز نہ جائیے وہ لوگ پیچھے پریشان ہوں گی۔"

"اور یہاں پڑے پڑے صحت برباد کر لوں؟"

"میں اورنگ۔ باد یا پونا کے لیے کل ہی سیٹ رزرو کرائے دیتا ہوں وہاں چلے جائیے۔"

"یہاں کا خدا اور ہے اور وہاں کا "اور"؟ اگر زندگی ہے وہاں بھی بچ جاؤں گا مرنا ہے تو حیدر آباد کے راستے میں بھی گاڑی لڑ سکتی ہے، پٹری سے اتر سکتی ہے، ڈاکہ

پڑ سکتا ہے ...."

مصطفےٰ صاحب لاجواب ہو کر چپ ہو رہے. شبیر صاحب سے بحث کرنا بہت مشکل تھا. شبیر صاحب نے مصطفےٰ صاحب کی پیٹھ تھپک کر کہا " گھبرائیے نہیں۔ کل صبح مجھے روانہ کر ہی دیجئے خدا نے چاہا تو کچھ نہیں ہوگا!"

ماسٹر شبیر حسین بڑے بلند سیرت اور مستقل مزاج انسان تھے. ان کی ذہانت، قابلیت ان کے ایثار و خلوص اور ان کی مضبوط اور دلکش سیرت کے دوست کیا دشمن بھی معترف تھے۔ وہ سچے اور پکے مسلمان اور مسلمانوں کی بہبودی و ترقی کے دل سے خواہاں تھے. سچے قوم پرست اور آزادی کے پرستار تھے. انھیں سیاست کے میدان میں کوئی شہرت حاصل نہ تھی لیکن اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ان میں سیاسی قیادت کی قابلیت نہ تھی بلکہ سیاست میں کامیابی کے لئے جن چالوں کی، جیسی جیسی خلاف ضمیر و ایمان حرکتیں کرنے کی ضرورت ہے وہ ان کے بس کی نہ تھیں. مسلمانوں کی حالت اس وقت یہ تھی کہ ان کو صرف نفرت و عداوت اور تفریق و علیحدگی کی بنیاد پر متحد کیا جا سکتا تھا۔ اور ان جذبات کو بھڑکا کر خود غرض اور ناعاقبت اندیش حضرات اپنا کام بنا رہے تھے شبیر حسین اور ان کے ساتھی دیکھ اور سمجھ رہے تھے کہ مسلمان اس وقت جس راستے جا رہے ہیں یہ انتہائی خطرناک ہے۔ ان کے لیڈر جو کھیل کھیل رہے ہیں وہ آگ کا کھیل ہے جو سب کچھ جلا کر خاک کر سکتا ہے.......... یہ راستہ مسلمانوں کے لئے تباہ کن اور خطرناک ہے ــــ مگر ان کی اور ان کے گنتی کے ساتھیوں کی آواز صرف چھوٹے سے مخلص، سمجھدار اور معقول پسند حلقے تک محدود تھی۔ عام مسلمان ان کو برا بھلا کہتے، غدار اور منافق کے ناموں سے یاد کرتے اور مسلمان قوم کا دشمن قرار دیتے تھے. لیکن باوجود سیاسی مخالفت کے تعلیم یافتہ اور

معقول پسند لوگ بحیثیت انسان اور تعلیمی رہنما کے ان کی بڑی قدر و عزت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ مخالف لوگ بھی جب کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہوتا تو ان سے مدد مانگتے، اور وہ خندہ پیشانی کے ساتھ ہر مدد کے لئے موجود ہو جاتے۔ کانگریس کے بڑے بڑے لیڈر بھی ان کا احترام کرتے اور ان سے مشورے لے لیا کرتے تھے۔ مگر خود شبیر حسین بہت منکسر مزاج آدمی تھے اور اپنا مقصد زندگی یہی سمجھتے تھے کہ زندگی بھر خلوص، ایمانداری اور محنت کے ساتھ اپنے قوم کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے کوشش کرتے رہیں۔ اور وہ اس میں منہمک رہتے تھے۔ لیکن صاحب غرض سفارشوں کی خاطر، بے فکرے محض ملنے اور گپ شپ کرنے کے لئے، دوست محبت کے باعث، عزیز اپنا حق جان کر، غرض ہر طرح کے لوگ ان کو ستاتے اور ان کے کام میں مخل ہوا کرتے۔ بیچارے مروت والے آدمی تھے۔ دل میں کتنے ہی ناراض ہوں، غصہ آئے مگر بظاہر آنے والے سے اخلاق سے ملتے اور اس کا ہر کام کرنے کو تیار ہو جاتے۔ پھر بھلا لوگوں کو اس کی فکر یا خیال کیوں ہوتا کہ اس غریب کو بھی کام اور آرام کے لئے وقت کی ضرورت ہے اور اس کا مقصد زندگی محض ان سے ملنا اور باتیں کرنا ہی نہیں۔

آج کل شبیر حسین کے اسکول میں چھٹیاں تھیں۔ ان کی صحت اچھی نہ تھی اور لوگوں کی یورش اور مختلف قسم کے بے کار کاموں کے زغے نے ان کے اعصاب پر برا اثر ڈالا تھا اور ان سے سب دوست انھیں مجبور کر رہے تھے کہ وہ کچھ عرصے باہر جا کر آرام کریں۔ مگر وہ ٹالتے رہے۔ ان کے ایک بھائی نے حیدر آباد بلایا، ایک نے پونا۔ ایک دوست نے مدراس۔ مگر وہ کہیں نہ گئے اور خدا جانے کیوں دل میں یہ سمائی کہ شملے چلنا چاہیے۔

۱۵ اگست گزر چکی تھی۔ ہندوستان آزاد ہو گیا تھا ——— دہلی میں یوم آزادی

کو بڑا شاندار جشن منایا گیا ـــــ بڑے بڑے مظاہرے ہوئے ـــــ لوگ خوشی سے بدحواس ہو رہے تھے ـــــ لیکن ہندوستان کے بعض حصوں میں آپس کے فساد اور لڑائی کا سلسلہ اب بھی جاری تھا ـــــ خیال تھا آزادی کے بعد یہ قصہ ختم ہو جائیگا مگر ایسا نہ ہوا۔ مسلمان پاکستان بننے سے خوش مگر بنگال و پنجاب کی تقسیم سے ناراض تھے...... پاکستان کے اعلان نے ہندوؤں اور خصوصاً سکھوں میں آتشِ غضب بھڑکا دی تھی ـــــ سرحدوں کے اعلان کے بعد مشرقی اور مغربی پنجاب میں فساد کے شعلے اور زیادہ بھڑک اٹھے ـــــ نہ شہر محفوظ تھے نہ گاؤں نہ ریلیں نہ موٹریں ـــــ اسٹیشنوں پر جھگڑا، سڑکوں پر خونریزی ـــــ مگر شبیر حسین صاحب نے اسی زمانے میں پنجاب کے سفر اور شملے جانے کا ارادہ پکا کر لیا ـــــ وہ اخبار بہت کم پڑھتے تھے اور اِدھر اُدھر کی گپوں اور افواہوں پر یقین نہیں کرتے تھے ـــــ اس لئے باوجود سب کی مخالفت کے انھوں نے اپنا جانے کا ارادہ قائم رکھا اور اگلے دن صبح کو سب سے رخصت ہو کر اسٹیشن پہنچے۔ مصطفےٰ صاحب اور دو ایک اور دوست اسٹیشن پر پہنچانے آئے تھے۔ ان کا ملازم محبوب ساتھ جا رہا تھا۔

ریل روانہ ہوئی۔ شبیر حسین کے درجے میں جو دو چار مسلمان تھے جو انبالے تک اتر گئے۔ راستے میں گاڑی جہاں جہاں ٹھیری مشتبہ لوگ اسٹیشن پر پھرتے نظر آئے اور قلی وغیرہ لاپتہ ...... انبالے سے آگے چل کر دو تین گھنٹے بعد گاڑی ایک اسٹیشن پر جا کر رک گئی اور بڑی دیر ہو گئی نہ چلی ـــــ معلوم ہوا کسی وجہ سے آگے نہ جائے گی۔ ریل سے سب مسافر اتر کر اسٹیشن سے باہر چلے گئے اور اب صرف اپنے درجے میں شبیر حسین، ان کا ملازم محبوب اور ایک اور درجے میں دو تین

مسلمان رہ گئے۔۔۔۔۔ اسٹیشن پر کسی قلی کا نام نشان نہ تھا۔ نہ کسی اسٹیشن ملازم کی صورت نظر آتی تھی ـــــــ ہاں والنیٹروں کی سی وردیاں پہنے کچھ اکالی حضرات اِدھر سے اُدھر گھوم رہے تھے ـــــــ ان "والنیٹروں" نے دوسرے درجے سے جو تین مسلمان اترے ان کا اسباب ہاتھ میں اٹھایا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔۔۔۔ دور سے شبیر حسین نے یہ دیکھا مگر کچھ سمجھے نہیں کہ یہ کیا قصہ ہے۔۔۔۔۔ نیا شہر، اجنبی جگہ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں جائیں ـــــــ یا یہیں اسٹیشن پر کسی دوسری گاڑی کے آنے کا انتظار کریں؟ انھوں نے ناشتہ نہیں کیا ـــــــ بھوک بھی لگ رہی تھی ـــــــ وہ کچھ پریشان سے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پچیس قدم اِدھر اور پچیس قدم اُدھر ٹہل رہے تھے اور تھوڑی دور اسباب کے ادھر محبوب بدحواس بیٹھا تھا۔

دو لمبے تڑنگے شخص ڈاڑھیاں چڑھائے، صافے باندھے، بڑی بڑی کرپانیں گلے میں ڈالے اکڑتے ہوئے شبیر حسین کے پاس آئے اور تیز لہجے میں پوچھا "تم مسلمان ہو؟" شبیر حسین نے اطمینان سے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور بولے "الحمد للہ" انھوں نے گھور کر دیکھا "کیا کہا؟" انھوں نے جواب دیا "بے شک مسلمان ہوں۔" دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پرے چلے گئے ـــــــ اتنے میں کسی نے آہستہ سے شبیر حسین کے کان میں کہا "باہر ہرگز نہ جانا۔" شبیر حسین نے پلٹ کر دیکھا تو بیس قدم کے فاصلے پر ایک فوجی سکھ چلا جا رہا تھا۔

شبیر حسین ابھی تک اطمینان سے ٹہل رہے تھے مگر اس تنبیہ کے بعد انھیں کچھ خطرے کا احساس ہوا۔۔۔۔ انھوں نے محبوب کی طرف دیکھا اور پاس جا کر بولے ـــــــ کیوں محبوب ـــــ ڈرتے تو نہیں ہو؟"

"نہیں میاں ـــــ پر یہ سارے کافر پچھے ہمیں کیوں گھور رہے ہیں قصہ کیا ہے مجھے ان کے تیور اچھے نہیں معلوم ہوتے ۔"

"ڈرو نہیں ـــ خدا پر بھروسہ رکھو ـــــ"

اتنے میں دو اکالی نوجوان شبیر حسین کے پاس آکر بولے "باہر چلو" انھوں نے بات سنی ان سنی کر دی ۔ دو اور آدمیوں نے ان کا بستر، ٹرنک، ٹفن باسکٹ اور اٹیچی کیس اٹھا لیا اور باہر کی طرف روانہ ہوئے ۔ محبوب لپک کر آگے بڑھا اور اٹیچی کیس کو جس میں شبیر حسین کے تمام روپے اور قیمتی کاغذات تھے ان کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کرنے لگا "کہاں لئے جاتے ہو ہمارا سامان ـــــ اِدھر رکھو ہم اسٹیشن ہی پر رہیں گے" نوجوان نے گلے میں لٹکی ہوئی تلوار میان سے کھینچ لی اور غرا کر بولا ... ابے شامت آئی ہے تیری ـــــ ابھی ڈھیر کر دوں گا۔"

شبیر حسین لپک کر آگے بڑھے اور غصے میں بھرے ہوئے محبوب کو ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا اور آہستہ سے بولے "احمق کیوں ان سے الجھ رہا ہے ۔"

چھ فٹ لمبا تڑنگا فوجی سکھ پھر آہستہ آہستہ شبیر حسین کے پاس سے گزرا ۔ اور بولا آپ کا "نام شبیر حسین ہے نا۔" انھوں نے مسکرا کر گردن ہلائی ـــــ اس نے کہا" میں نے آپ کو دیکھا ہے ـــــ میں جانتا ہوں آپ کو ـــــ ماسٹر صاحب آپ کی جان خطرے میں ہے ۔ آیئے میں آپ کو ایک جگہ بٹھا دوں ۔ جب تک میں واپس نہ آؤں اسٹیشن سے باہر نہ نکلئے گا ۔ میں آپ کو بچا کر نکال لے جانے کی کوشش کرتا ہوں......"

یہ کہہ کر فوجی افسر شبیر حسین اور محبوب کو لئے ہوئے اسٹیشن ماسٹر کے

کمرے میں آیا۔ اسٹیشن ماسٹر ایک میز کے سامنے بیٹھا لکھ رہا تھا ـــــ اس نے جا کر کہا " دیکھو جی یہ ماسٹر شبیر حسین بڑے مشہور آدمی ہیں، نیشنلسٹ مسلم ـــــ گاندھی جی اور جواہر لال کے دوست ـــــ جب تک میں واپس آؤں ان کی حفاظت کرنا تمھارا کام ہے ـــــ ورنہ مجھے جانتے ہو ـــــ "

اسٹیشن ماسٹر نے تیوری پر بل ڈال کر پہلے فوجی کو اور پھر ان لوگوں کو دیکھا اور اپنے کام میں لگ گیا۔

فوجی باہر چلا گیا جہاں بہت سے بھوکے بھیڑیے نئے شکار پر جھپٹنے کے لئے بیتاب گھوم رہے تھے۔ ایک طرف ایک چھ سال کے پیارے سے بچے کی لاش کرپان سے چھدی ہوئی پڑی تھی۔ دو نوجوان اور ایک بوڑھا خون میں لت پت ؟ اسٹیشن کے باہر ادھر اُدھر کٹے ہوئے درختوں کی طرح منتشر پڑے ہوئے تھے۔

فوجی افسر نے لوگوں کو سمجھانا شروع کیا کہ ـــــ اندر جو مسلمان ہے وہ بڑا اچھا آدمی ہے "نیشنلسٹ مسلم ہے، قومی خادم ہے ـــــ ہندوؤں سکھوں کا دوست ہے ـــــ مگر لوگوں کی حالت پاگل کتوں اور مجنونوں کی سی تھی جن میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی ـــــ ہاتھ آیا ہوا شکار کس طرح چھوڑ دیں ـــــ اور کیوں چھوڑ دیں ؟ مغربی پنجاب میں ہمارے بھائیوں پر جو ظلم ہو رہا ہے اس کا بدلہ نہ چکائیں وہاں بے گناہوں کو کیا نہیں مارا جا رہا ہے ؟ ہر مسلمان ہمارا دشمن ہے، ہر مسلمان کو مارنا ہمارا دھرم ہے، ہمیں انتقام لینا ہے ـــــ انتقام ـــــ "

فوجی سردار نے دیکھا کہ ان کو سمجھانا بے کار اور بے اثر ہے ـــــ وہ لپک کر گیا تاکہ اپنی "جیپ گاڑی" لے آئے اور کسی طرح شبیر حسین کو بچا لے۔

اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کے سامنے پانچ چھ آدمی لمبی لمبی تلواریں ہاتھ میں لئے ٹہل رہے تھے اور بار بار شبیر حسین کو اشارے سے باہر بلا رہے تھے لیکن وہ چپ چاپ بیٹھے تھے۔ محبوب کا چہرہ فق تھا اور سارا جسم کانپ رہا تھا

آخر تین چار آدمی اندر گھس آئے اور محبوب و شبیر حسین کا ہاتھ پکڑ کر باہر کی طرف گھسیٹ لیا۔ اسٹیشن ماسٹر چپ چاپ بیٹھا دیکھتا رہا۔ نہ اس نے فسادیوں کو منع کیا نہ ان لوگوں کی کوئی مدد کی ——————

محبوب بہت کش مکش کر رہا تھا کہ دشمن کے ہاتھ سے چھوٹ جائے مگر شبیر حسین نے کوئی مدافعت نہیں کی۔ چپ چاپ اطمینان کے ساتھ ان لوگوں کے ساتھ ہو لئے۔ وہ جانتے تھے کہ اتنے مسلح آدمیوں سے جد و جہد اور کش مکش کرنا لا حاصل ہے —— وہ ایک شہید کی شان سے سر بلند کئے قاتلوں کے ساتھ چلے جا رہے تھے۔ دل پر خوف و ہراس کی جگہ سکون و طمانیت کا جذبہ طاری تھا۔ قوم کا غم، اسکول کی فکر، جان کا خیال، بال بچوں کی محبت، اس وقت کوئی چیز ان کو نہیں ستا رہی تھی۔ صرف ایک خیال، ایک جذبہ .... ان کے دل میں جاگزیں تھا —— وہ خدا کی راہ میں شہید ہو رہے ہیں —— امام حسین کی پیروی کی سعادت ان کو نصیب ہو رہی ہے .. .. .. ان کا چہرہ روحانی جلال سے منور تھا .. .. ..

ان کے باہر آنے کے بعد لوگوں میں آپس میں کچھ جھگڑا ہونے لگا۔ دو چار بڈھے کہتے تھے کہ اس آدمی کو چھوڑ دو —— لیکن جوان بپھرے ہوئے تھے کہ ہرگز نہیں۔ ہر ہر مسلمان کو مار کر ہمیں بدلا لینا ہے —— اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرنا ہے —— اسے چھوڑ دیں —— تاکہ کل کو یہ ہمیں مارے ؟

فوجی افسر نے دور سے دیکھا کہ شبیر حسین کو لوگ پکڑے ہوئے باہر لا رہے ہیں وہ تیزی سے اپنی جیپ کار لے کر اُدھر بڑھا ـــــــ اُس نے دھڑکتے ہوئے دل سے دیکھا کہ شبیر حسین مسکراتے ہوئے سامنے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ اور دو بندوقیں ان کی طرف چھتیائی گئی ہیں ....

وہ بجلی کی طرح کود کر گاڑی سے باہر آیا، اور شبیر حسین کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا اور اپنی "اسٹین گن" ہاتھ میں لے لی اور اسی طرح اپنی کار کی طرف بڑھا، فسادی بھپرے ہوئے، فوجی سردار کو برا بھلا کہہ رہے تھے ـــــــ اُس نے شبیر صاحب کو اشارہ کیا وہ کود کر گاڑی میں سوار ہو گئے اور انھیں کے ساتھ محبوب بھی ـــــــ فوجی خود بھی گاڑی میں بیٹھ گیا ـــــــ لوگوں نے کار کو گھیر لیا لیکن فوجی سردار نے ڈپٹ کر کہا "اگر کسی نے قدم آگے بڑھایا یا میرے مہمانوں کو ہاتھ لگایا تو یہ میری "اسٹین گن" تم سب کا خاتمہ کرنے کو کافی ہے ـــــــ خبردار ـــــــ تم آگے بڑھے اور میں نے فائر کیا۔ شبیر صاحب میرے مہمان ہیں ـــــــ میں انھیں جان بچانے کا قول دے چکا ہوں ـــــــ میں اپنی جان دے کر ان کی جان بچاؤں گا۔ مگر تم سب کو پہلے ختم کروں گا ـــــــ"

ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کی اور فوجی بندوق کا رُخ مجمع کی طرف کئے کھڑا رہا فسادی گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹے اور کار بجلی کی طرح کوند کر نظر سے اوجھل ہو گئی ـــــــ وہ ستر میل کی رفتار سے اس شہر کو چھوڑ کر کسی پر امن مقام کی طرف بڑھ رہی تھی۔

بیسویں صدی کے ان تہذیب یافتہ انسانوں کی بربریت اور حیوانیت پر شبیر حسین کا دل خون ہو رہا تھا...... ان کے ملک کے انسان اس درجہ گر گئے ہیں؟

آپس میں وحشیوں اور درندوں کی طرح ایک دوسرے کو چیر پھاڑ کر رہے ہیں؟ شرافت ہمدردی، بہادری، جرأت، مظلوم کی حمایت، ظالم سے نفرت، ساری انسانی خوبیاں ختم ہو چکیں؟ بزدلی، نامردی، ظلم وستم، خوف و نفرت نے انسانوں کو مردم خوار درندہ شیطان سے بدتر کوئی مخلوق بنا دیا ہے ـــــ اب اس ملک کی تباہی میں کیا شک رہ گیا ہے؟ اگر آج نہیں تو یہ کشتی کل ضرور ڈوب جائے گی ـــــ

کتنی دیر شبیر حسین ان خیالات میں غرق بیٹھے رہے کہ ان کے کان میں آواز آئی "ماسٹر صاحب اب ہم محفوظ ہیں!" انھوں نے دیکھا کہ ان کا محافظ فوجی سردار اب تک پستول ہاتھ میں لئے چوکنا بیٹھا ہے

شبیر حسین کے خیالات نے پلٹا کھایا ـــــ جہالت، غلامی، مصیبت، ناعاقبت اندیشی نے ان کے ہم وطنوں کو ایسا کر دیا ہے ـــــ اور سب سے زیادہ چند شریر النفس شیطان صفت فسادیوں کے گروہ کی کوششوں نے اچھے خاصے امن پسند صلح جو انسانوں کو وحشی اور درندہ بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ـــــ مگر ـــــ ـــــ مگر ـــــ پھر بھی یہ انسان ہیں ـــــ انھیں وحشیوں میں خال خال انسان بھی نکل آتے ہیں ـــــ سچے انسان، بہادر سورما ـــــ جو دوسروں کی جان کی خاطر اپنی جان کی پروا نہیں کرتے ـــــ حق اور انصاف کے لئے اپنوں سے لڑ بیٹھتے ہیں ـــــ انسان کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں ـــــ انسانیت کی خاطر شاید خدا ایسے نیک نفس انسانوں کی بدولت ان کے ملک کی ڈوبتی ہوئی کشتی پار لگا دے ـــــ شاید ایسے لوگوں کی کوششوں سے آگ کے خوفناک شعلے بجھ جائیں ـــــ شاید پھر ان وحشی درندوں میں سوئی ہوئی انسانیت بیدار ہو جائے ـــــ

ان کا دل جو مایوسی اور غم سے لبریز تھا امید کی ایک ہلکی سی کرن سے روشن ہوگیا۔

اور جب شبیر حسین نے حفاظت کے ساتھ پہنچکر اپنے گھر کے دروازے پر قدم رکھا تو پہلی مرتبہ انھیں اس کا پورا احساس ہوا کہ وہ حقیقت میں موت کے منھ سے نکل کر آئے ہیں ــــــــ سینکڑوں دشمن ان کو گھیرے ہوئے تھے ــــــــ تلواریں چمک رہی تھیں ــــــــ بندوقیں ان کی طرف چھتیا لی گئی تھیں ــــــــ ایک سیکنڈ کی دیر ان کو دوسری دنیا میں پہنچا سکتی تھی ــــــــ ان کی آنکھیں بھر آئیں اور سچے عجز و نیاز کے ساتھ ان کا سر ــــــــ اس حافظ حقیقی کی بارگاہ میں جھک گیا جس نے سارے وسیلے سارے ذرائع ــــــــ زیست کی ہر امید ختم ہونے کے بعد انھیں موت کے پنجہ سے بچا لیا ــــــــ شاید وہ ان سے کچھ کام لینا چاہتا ہے۔

دستگیر

"نجمہ بیٹی شام ہو گئی۔ اب تک تیرے اباجی واپس نہیں آئے۔"

"اماں تم نے انھیں جانے ہی کیوں دیا۔ شہر میں تو قیامت برپا ہے ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم ہے اور اباجی باہر راشن لینے چلے گئے۔"

"بیٹی دو دن تو آدھا تہائی پیٹ کھاتے ہو گئے تھے۔ آج اگر کرفیو کھلنے کے وقت راشن لینے نہ جاتے تو کل گھر میں بالکل ہی فاقہ ہوتا۔"

"بلا سے فاقہ کر لیتے۔ اب تو اباجی کی جان کا خوف ہے۔ اللہ نہ کرے ان کے دشمنوں کو کچھ ہو گیا تو......"

"اوئی لڑکی تو تو اور میرے ہاتھ پاؤں پھلائے دیتی ہے (ٹھنڈی سانس بھر کر) آج کو جوان بیٹا زندہ ہوتا تو کاہے کو تیرے بڈھے باپ کو اس ضعیفی میں باہر جانا پڑتا۔ اس غدر کے زمانے میں جان ہتھیلی پر لے کر گئے ہیں۔ اللہ حفاظت کرنے والا ہے۔"

"الٰہی اباجی کی جان کی خیر"

"ستارہ کہاں ہے؟"

"شاید اوپر ہے اماں۔"

"ستارہ ستارہ ۔ اوپر بیٹھی کیا کر رہی ہے؟ نیچے آ ستارہ"

سترہ اٹھارہ سال کی خوبصورت، تندرست، چونچال لڑکی دھم دھم کرتی سیڑھیوں سے اتری اور ماں کے پاس آ کر بولی "کیا ہے اماں؟"

"کہاں تھی تو؟"

"اوپر کھڑکی سے اباجی کو دیکھ رہی تھی۔ کہ شاید آتے ہوں!"

"اللہ رے تیری دیدہ دلیری۔ آج کل کوئی کھڑکی کھولتا ہے؟ نیچے سے کوئی گولی مار دے تو" بہن نے میٹھی جھڑکی دے کر کہا

"اُنہ مجال پڑی ہے کسی کی میں نے بھی بہت سے پتھر جمع کر رکھے ہیں کمبختوں کا مارے پتھروں کے منہ بگاڑ دوں گی!"

ماں نے ڈانٹا "کیا بک بک کر رہی ہے، بیٹی بہت برا وقت پڑا ہے ہر وقت خدا سے خیر مانگو ــــ میرا تو خون خشک ہوا جاتا ہے ــــ الٰہی تیرے ابا خیر سے واپس آ جائیں...... اللہ نہ کرے نہ آئے تو اس اکیلے ڈھنڈار گھر میں دو جوان لڑکیوں کے ساتھ ایسے برے زمانے میں کیسے رہوں گی۔ مولا میری لڑکیوں کی جان و آبرو اور ان کے باوا کی جان تیری حفاظت میں ہے...... میں تیری حقیر ذلیل لونڈی ان پر قربان ہو جاؤں۔ پر ان کی جانیں اور آبرو بچا لیجیو"

بڑی بی کی دھندلی آنکھوں سے، ان کے جھریوں پڑے گالوں پر آنسوؤں کا مینہ برسنے لگا۔ نجمہ نے اپنا سر ماں کے زانو پر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ستارہ نے اپنی باہیں ماں کے گلے میں ڈال دیں اور مضبوط لہجے میں بولی۔ "میری اماں، اچھی اماں میں تم پر سے صدقے گھبراؤ نہیں ــــ اباجی انشاء اللہ خیریت سے ہونگے

اماں دیکھو نا...... کرفیو زرا دیر کو تو کھلا تھا...... سینکڑوں آدمی راشن لینے والے ہوں گے۔ ابا کو راشن ملتے ہیں دیر ہوئی اتنے میں کرفیو کا وقت ہو گیا ہوگا اسی لئے اباجی نہیں آسکے۔ وہیں آس پاس کسی جاننے والے کے ہاں ٹھیر گئے ہونگے"

"اللہ تیرے منھ کا کہا کرے بٹی۔ پر کیا کروں بچی میرا دل تو اندر سے بیٹھا جارہا ہے"

"اماں آج یوسف بھائی کے بھی تو آنے کی خبر تھی نا؟"

"مولا میرے یوسف کی جان کی خیر ــــــ ہے ہے نوج وہ آج کل یہاں آئے۔ ریلوں میں تو سنتی ہوں خون ہو رہے ہیں، اسٹیشن پر کسی کی جان نہیں بچتی ...... یا اللہ یوسف کو تو ہی بچانے والا ہے"

نجمہ کا چہرہ پہلے شرم سے سرخ ہوا۔ اور پھر خوف سے زرد ہو گیا۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ آگیا، "یا اللہ میرے یوسف کا تو ہی نگہبان ہے" اس نے دل ہی دل میں اپنے منگیتر کے لئے دعا مانگی۔

"اماں یوسف بھائی انشاء اللہ بالکل محفوظ ہوں گے۔ بھلا ایسے حالات میں ان کے ماں باپ نے انھیں گھر سے چلنے ہی کیوں دیا ہوگا...... وہ علیگڈھ سے روانہ ہی نہیں ہوئے ہوں گے۔ تم زرا فکر نہ کرو" ستارہ نے کہا۔ ماں چپ چاپ روتی اور دعا مانگتی رہی۔

ستارہ نے نجمہ کے گلے میں اپنی باہیں ڈال دیں۔ "میری آپا۔ تمھیں میری قسم پریشان نہ ہو۔ کہو تو قسم کھاؤں کہ یوسف بھائی اپنے گھر پر خیریت سے ہوں گے"

نجمہ نے چپ چاپ بہن کو اپنے دھڑکتے ہوئے سینہ سے لپٹا لیا۔ کچھ بولی نہیں..... بول ہی نہ سکی۔

مغرب کا وقت ہوگیا تھا۔ ماں وضو کر کے لکڑی کی چوکی پر نماز پڑھنے لگیں۔ ستارہ نے نجمہ سے کہا "آپا سارا دن تو فاقہ سے گذر گیا۔ چلو کچھ پکا لیں۔ بھوک لگی ہے۔"

"بی بی پکانے کو ہے کیا جو پکاؤں۔"

"نہیں آپا میں نے دیکھا تھا کہ ایک ڈبے میں تھوڑے سے موٹے چاول پڑے ہیں اور کسی ہانڈی میں دو مٹھی دال بھی ہے۔ چلو کھچڑی پکائے لیتے ہیں، اماں بھی ذرا سی کھا لیں گی۔"

"جیسی تمھاری مرضی۔ پر میرا تو کسی بات کو جی نہیں چاہتا... جانے ابا جی پر کیا بپتا پڑی۔ تارہ مجھے تو ان کی جان کا سخت خطرہ ہے۔"

"میری آپا للہ یہ نہ کہو...... اللہ انھیں بچائے گا۔ انھیں کچھ ہوگیا تو پھر سہارا کون ہے۔ ہے ہے آج کل تو محلے والے پڑوسی، عزیز قریب کوئی بھی کسی کی مدد نہیں کرتے..... کر بھی نہیں سکتے۔ قیامت ہے قیامت۔ نفسا نفسی کا عالم ہے کوئی گھر میں گھس آیا تو کیا ہوگا...... آپا...... آپا......"

نجمہ: (بہن کو گلے سے لپٹا کر) واہ وا۔ کہاں تو مجھے اور اماں کو سمجھا رہی تھیں اور کہاں اب خود ایسی باتیں کر رہی ہو۔ بی بی سب سے بڑا سہارا..... سب سے بڑا بھروسہ تو خدا کا ہے وہ چاہے گا تو بچا لے گا۔ اور اگر مرنا ہے تو خیر مر جائیں گے..... ایسے منحوس زمانے میں زندہ رہنے سے مرنا ہزار درجہ بہتر ہے...... ان درندوں اور

وحشیوں کی دنیا میں زندہ رہ کر کیا کرنا ہے؟"

ستارہ: (کانپ کر) آپا میں مرنے سے تو نہیں ڈرتی۔ اگر یہ یقین ہو جائے کہ مر ہی جائیں گے تو اطمینان ہو جائے...... پر ہم بدنصیب عورتوں کے لئے موت ہی کا تو ڈر نہیں۔ اس سے اور کہیں زیادہ افسوسناک خطرے بھی تو ہیں...... ہے ہے اگر کسی نے پکڑ لیا تو......"

نجمہ: (لرزتی ہوئی اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ کر) تجھے میری قسم تارہ ایسی باتیں نہ کرو ورنہ میرا کلیجہ پھٹ جائے گا...... چلو چل کر نماز پڑھیں...... اللہ کے سامنے گڑگڑائیں وہی حفاظت کرنے والا ہے"

ایمان اور عقیدہ سخت سے سخت وقت اور انتہائی مایوسی کی حالت میں انسان کو سہارا دیتا ہے۔ دونوں بہنوں نے جا کر نماز پڑھی۔ دعا مانگی تو دل کو بڑی ڈھارس محسوس ہوئی۔ باورچی خانے میں جا کر آگ جلائی۔ کھچڑی چڑھائی اور چپکے چپکے باتیں کرنے لگیں۔ حال یہ تھا کہ ذرا سی آہٹ، خفیف سے کھٹکے سے چونک پڑتی تھیں سناٹے کا یہ عالم کہ اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز خود کان میں آ رہی تھی۔ کھچڑی پک چکی تو ایک پلیٹ میں نکالی۔ کچھ باپ کے خیال سے ہانڈی میں چھوڑ دی۔ اور اس کو چولھے پہ گرم جگہ رکھ دیا اور ماں کے پاس آئیں جو نماز کی چوکی پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں سینہ سر جھکا ہوا تھا، آنکھوں سے آنسو ٹپک ٹپک کر جا نماز کو تر کر رہے تھے۔

لڑکیوں نے منت خوشامد کر کے ماں کو راضی کیا کہ چند نوالے کھا لیں بڑی بی نے آنکھیں اور منہ پوچھا اور لڑکیوں کی خاطر کھچڑی زہر مار کرنے لگیں۔ دو تین نوالے کھا کر ہاتھ کھینچ لیا۔

"اوئی کیسی کرموی کھچڑی ہے ـــــ خدا خیر کرے ـــــ میرے تو حلق سے نہیں اترتی۔"

بہنوں نے سہم کر ایک دوسرے کو دیکھا "اماں شاید نمک تیز ہو گیا...... یا دیگچی بد قلعی تھی اس کی وجہ ہو گی۔"

"نہیں بیٹی...... یہ بڑی بدشگونی ہے کھانے کا کڑوا ہونا...... جانے کیا ہونے والا ہے...... اوئی اللہ یہ شور کیسا ہے۔"

"ہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گلی میں بہت سے آدمی چل رہے ہیں۔"

"کرفیو میں کون گھر سے نکلا ہو گا۔"

"شاید سپاہی پہرہ دیتے پھر رہے ہوں۔"

سب نے ہاتھوں سے نوالے چھوڑ دیئے اور غور سے سننے لگیں...... چہرہ زرد...... آنکھیں پھٹی...... دل کی یہ حالت جیسے اب دھڑکتے دھڑکتے بند ہو جائیگا۔

کسی نے زور سے کواڑوں کو دھکا دیا...... ماں نے ہکلاتے ہوئے "کوئی ہمارے دروازے کو دھکا دے رہا ہے...... شاید تمھارے ابا آئے ہوں؟"

"میں دیکھوں جا کر" ستارہ نے پوچھا،

"نہ ـــــ نہ ـــــ ایسا غضب نہ کیجو بچی...... وہ ہوں گے تو آواز دیں گے۔"

"اماں ادھر کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھ لیں کہ کیا قصہ ہے۔" نجمہ نے کہا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے بیٹی کہ کہیں کوئی گولی...... اللہ نہ کرے......"

ماں جملہ پورا نہ کر سکیں۔

"اماں جی ہم زرا سی ریخ آہستہ سے کھول کر دیکھیں گے......" یہ کہہ کر دونوں بہنیں تیزی سے مگر دبے پاؤں اوپر گئیں۔ اور چند لمحے کے بعد لرزتی ہوئی آئیں اور آکر ماں سے لپٹ گئیں...... دروازے پر برابر دھکے پڑ رہے تھے لڑکیوں کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی......"اماں جی...... اماں جی.... باہر...... باہر...... کئی آدمی...... کھڑے ہیں...... کیا ہوگا اماں...... کون بچائے گا اماں...... ہائے اماں جی...... اماں جی......"

ماں نے دونوں بچیوں کو زور سے اپنے سینے سے لپٹا لیا اور انگلی آسمان کی طرف اٹھائی" وہ ہے مدد کرنے والا۔"

دروازے پر اب زور زور سے چوٹیں پڑ رہی تھیں...... ماں ایک منٹ تک آنکھیں بند کئے کچھ سوچتی رہی اور پھر تیز لہجے میں بولی "میری جان...... میں تم پر صدقے ___ ہمت سے کام لو، خدا پر بھروسہ رکھو ___ اگر موت کا وقت آگیا ہے تو کوئی فکر نہیں مرنا ایک دن سب کو ہے اس سے کیا ڈرنا! پر ماں صدقے اپنی آبرو جان دے کر بھی بچانا ___ جاؤ تم دونوں لپک کر کوئلے لکڑی کی کوٹھری میں گھس کر اندر سے بند کر لو اور کاٹھ کباڑ کے پیچھے چھپ جاؤ...... شاید ان غارت ہونوں ___ جھاڑو ماروں کا منحوس قدم وہاں تک نہ پہنچے......"

"ہائے آپ کو یہاں اکیلا چھوڑ دیں!"

"جلدی کرو ___ بیٹی جلدی کرو ___ مجھے یہاں رہنے دو ___ میری فکر کرنے کا وقت نہیں ___ میری جان جائے تو بلا سے ___

صدقے کی تھی تم پر سے ہزار دفعہ ــــ پر تمھاری ــــ ہائے میری جان تمھاری آبرو خطرے میں ہے ــــ جاؤ جلدی کرو ــــ دروازہ ٹوٹنے کے قریب ہے !!

نجمہ اور ستارہ ایک منٹ تک زور سے ماں کے گلے سے لپٹی رہیں اور پھر بھاگ کر لکڑی کوئلے کی کوٹھری میں گھس کر اسے اندر سے بند کر لیا۔

ماں نے اپنا سر حافظِ حقیقی کی بارگاہ میں جھکا دیا اور زندگی میں پہلی بار انتہائی خلوص، انتہائی عاجزی، انتہائی عقیدت کے ساتھ اپنی بچیوں کے لئے دعا مانگنے لگی۔ منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی، ہونٹوں کو ذرا سی حرکت نہ تھی...... ہاں آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ ضرور جاری تھا۔ اور دل براہِ راست اپنے مالک سے التجا کر رہا تھا۔

پرانے زمانے کے بنے ہوئے مضبوط اور بھاری کواڑوں نے جہاں تک ہو سکا اپنے مالکوں کے بچانے کی کوشش کی۔ اور مسلسل پندرہ منٹ تک آٹھ سات آدمیوں کی چوٹوں کا مقابلہ کرتے رہے ــــ لیکن آخر کہاں تک؟ ایک دل خراش اور خوفناک آواز کے ساتھ یہ بے جان محافظ، بے زبان سپاہی زخمی اور پسپا ہو کر زمین پر گر پڑے...... دشمنوں کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔

بھوکے بھیڑیئے...... خونخوار درندے...... سارے گھر میں دوڑنے اور اپنے شکاروں کو تلاش کرنے لگے۔ کچھ گھر کا سامان لوٹنے اور توڑنے پھوڑنے میں مصروف ہو گئے اور کچھ آدمی آدمیوں کے تلاش کرنے میں......

انھوں نے دیکھا...... ایک کونے میں ــــ لکڑی کی چوکی پر، ایک انسانی گٹھری، سارے بدن کو چادر میں چھپائے، اوندھی پڑی ہے ــــ ان درندوں نے،

جنھیں قدرت نے حیوان ناطق بنا کر انسانیت کے نام کو دھبہ لگایا تھا ــــ پہلے اپنی زبان کے گندے ہتھیار استعمال گئے اگر بڑی بی نے کسی بات کا جواب نہ دیا نہ سجدہ سے سر اٹھایا ...... جواب نہ ملنے پر انھیں نماز کی چوکی پر سے گھسیٹ لیا گیا اور یہ دیکھ کر کہ ان کا شکار محض ایک سفید سرد اور جھریوں بھرے چہرے والی بڑھیا ہے۔ ان کی حیوانیت اور ہوسناکی قہر و غضب سے بدل گئی .... بڑی بی کو ڈرا دھمکا کر انیزوں اور کرپانوں کی نوکیں چبھا چبھا کر، ہر طرح سے گھر کے دوسرے لوگوں کا پتہ پوچھا گیا۔ لیکن بڑی بی نے ان پاگل کتوں کی کسی بات کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا ــــ اور اس حالت میں بھی وہ اپنا بوڑھا سر و چہرہ اجنبی لوگوں کی نظروں سے بچانے کے لئے کانپتے ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے تھیں ...... اور "یا اللہ ــــ یا اللہ" کے سوا کوئی لفظ ان کے متبرک ہونٹوں سے نہیں نکل رہا تھا۔

چند منٹ میں ان کا نحیف و نزار جسم ہتھیاروں سے چھلنی، خاک و خون میں لتھڑا زمین پر بے حس و حرکت پڑا تھا، ہاتھ اب تک چہرہ کو ڈھانپے تھے۔ جن کی پشت پر بت سے کرپانوں اور چاقوؤں کے گھاؤ لگے تھے۔ اور ان کی روح اپنے حافظ حقیقی کی بارگاہ میں فریاد کرنے کے لیے جا چکی تھی۔

بڑی بی کو شہید کرنے کے بعد انھوں نے سارا گھر چھان مارا ــــ ہر کام کی چیز لوٹ لی ــــ جو بیکار سمجھی اسے توڑ پھوڑ کر ڈال دیا ...... اور آخر کار ان کے منحوس قدم لکڑی کی کوٹھری کی طرف بڑھے ..... اور اسے اندر سے بند پا کر انھیں ہو گیا کہ ان کے اصلی شکار اس کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔

ستارہ اور نجمہ ایک دوسرے سے لپٹی، لکڑیوں کی ڈھیر کی آڑ میں، کوئلے کی پرانی

بوریاں اوڑھے، دم سادھے بیٹھی تھیں۔ گھر کی تباہی، باپ کی جان کا خوف، ماں کی شہادت یوسف کی محبت ـــــ اس وقت سب جذبات وخیالات سے بیگانہ وبے حس اس وقت صدق دل سے صرف یہ دعا کر رہی تھیں کہ ان کو اس وقت موت آجائے اور ان کی عزت ان وحشیوں سے محفوظ رہے .... دروازے پر چوٹیں پڑ رہی تھیں اور یہ دونوں بے کس و بے بس بہنیں ایک دوسری کو زور سے پکڑے بے حس وحرکت پتھر کی بے جان مورتیوں کی طرح بیٹھی تھیں۔

دہلی کے ۵۔۶۔۷۔۸ ستمبر کے فساد نے لوگوں کے دلوں میں غدر کی یاد تازہ کردی۔ شاید یہ قیامت غدر سے بھی زیادہ خوفناک اور روح فرسا تھی۔ اس وقت ایک غیر ملک کے، غیر قوم کے افراد ہندوستانیوں پر ظلم کر رہے تھے۔ مگر ان کے لیے گاؤں میں، آس پاس کے محفوظ قصبوں میں، پڑوسیوں کے گھروں میں، برادرانِ وطن کے دل میں ...... پناہ لینے، بچنے اور محفوظ ہونے کے لئے جگہ موجود تھی .... جان وآبرو کو ایسا خطرہ درپیش نہ تھا ـــــ لیکن آزاد ہندوستان کے ان نئے آزاد شدہ لوگوں نے جو سینکڑوں برس کی غلامی اور حاکم کی سیاسی چالوں کی بدولت حیوانوں سے بدتر بن چکے تھے، جن کی اخلاقی حالت بد سے بدتر ہو چکی تھی، جن کے دلوں میں محبت واتفاق کی جگہ نفرت وتعصب نے لے لی تھی... آزادی ملتے ہی آپس میں خونخوار بھیڑیوں کی طرح لڑنا شروع کر دیا۔ انھوں نے اپنے ہی بھائیوں کے گلے کاٹنے، اپنی ہی بہنوں کی عزتیں لینی اور اپنے ہی بچوں کا خون بہانا شروع کر دیا۔ انھوں نے وہ خوفناک اور شرمناک حرکتیں کی ہیں جن کی مثال کم سے کم ہندوستان کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔

جو سیاسی و اخلاقی رہنما کل ہندوستان کو آزادی ملنے کی خوشی میں پھولے نہیں سما رہے تھے ___ جن کی کوششوں اور قربانیوں کی بدولت آج یہ مبارک وقت آیا تھا، جنھوں نے ملک کو غلامی کی زنجیریں توڑ کر اسے آزادی کے راستے پر قدم رکھنا بتایا تھا، جو ملک کی بہبودی و اصلاح کی اسکیمیں بنا رہے تھے۔ اور وہ تدبیریں سوچ رہے تھے جن سے کام لے کر جلد سے جلد اپنے جاہل، مفلس اور گرے ہوئے ملک کو بام ترقی پر پہنچا سکیں...... آج درد و غم سے ان کے دل لبریز تھے..... شرم سے ان کے سر جھکے ہوئے۔ وہ اس خانہ جنگی پر، انسانوں کی اس درندگی پر، ملک کی اس بربادی پر خون کے آنسو رو رہے تھے...... ان کی جان توڑ کوششیں فساد کو جلد سے جلد روکنے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھیں...... کہ فوج اور پولیس اپنے فرائض بھول کر، بجائے ظالموں کے، مظلوموں اور نہتوں پر ظلم ڈھانے پر تُلی ہوئی تھی...... پر مخلص اور سچے رہنما اپنی جان کی بازی لگا کر بھی اس فساد کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

پنڈت جواہر لال نہرو ___ جن کے حساس اور دردمند دل کے لئے یہ واقعات سخت تکلیف دہ اور انتہائی روح فرسا تھے، دن رات، چوبیس گھنٹے، دوڑ دھوپ بھاگ دوڑ میں مصروف اور شہر میں امن و امان قائم کرانے کی کوشش میں منہمک تھے۔ جھگڑے کی جگہ خبر ملتے ہی خود پہنچ جاتے ___ مصیبت زدوں اور مظلوموں کی مدد کرنے اور ظالموں کو سزا دینے کی کوشش کرتے ___ شہر کا دورہ کرتے ___ گلیوں کے چکر لگاتے......

رات کے آٹھ بجے تھے۔ پنڈت نہرو اپنی کار میں اکیلے سوار شہر کے فساد زدہ اور

مخدوش حصوں کا دورہ کرتے کراتے شہر کے ایک حصے میں پہونچے ...... انھوں نے کار رکوائی اور اترے ہی تھے کہ سامنے کی گلی میں سے آہیں شور وغل کی آوازیں سنائی دیں پنڈت جی اس طرف بڑھے ___ ڈرائیور نے جو دیکھا کہ پنڈت جی اکیلے اور نہتے جا رہے ہیں تو وہ بھی ان کے پیچھے لپکا ___ ذرا آگے بڑھے تھے کہ پنڈت جی کے کان میں دو دلخراش نسوانی چیخیں پڑیں اور وہ بھاگتے ہوئے اندر گلی میں گھس گئے .... کچھ لوگوں میں آپس میں کش مکش ہو رہی تھی۔ اور فوج کے دو سپاہی بے فکری سے کھڑے بیڑی پی رہے تھے! پنڈت جی نے ٹارچ کی روشنی ڈالی ...... دو نوجوان اور حسین لڑکیاں گرد، مٹی اور کوئلے کی سیاہی میں لت پت چھ سات مردوں سے کش مکش کر رہی تھیں۔ ان کے بال لوگوں کے نوچنے کھسوٹنے سے بکھرے اور ٹوٹے ہوئے تھے۔ سروں کی اوڑھنیاں چھین لی گئی تھیں، کرتے پھٹ گئے تھے ...... چھ سات بدمعاش ان کو گھیرے ہوئے تھے۔ کوئی ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا تھا، کوئی چوٹی پکڑ کر جھٹکا دے رہا تھا، کوئی چٹکی لیتا تھا، اور سب کے سب گندے، فحش الفاظ بک رہے تھے۔ اور اس کوشش میں تھے کہ ان کو کھینچ کرلے جائیں۔ مگر وہ دونوں پوری قوت سے ظالموں کے ہاتھوں سے بچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ "بچاؤ ...... بچاؤ" کی دلخراش آواز ان کے زخمی ہونٹوں سے مسلسل نکل رہی تھی۔

غصے سے لرزتے ہوئے پنڈت جی آگے بڑھے "خبردار" بدمعاشوں نے غضبناک ہو کر پلٹ کر دیکھا کہ یہ کون اپنی جان کا دشمن ان کے منہ آنے کی جرأت کر رہا ہے؟ مگر پنڈت نہرو کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ خوف سے کانپنے لگے ...... ان کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی نجمہ اور ستارہ بجلی کی طرح تڑپ کر پنڈت جی کی طرف لپکیں اور ان کے

قدموں سے لپٹ گئیں۔

"بچاؤ ——— بچاؤ .... ان بدمعاشوں سے بچاؤ"

بدمعاش ایک منٹ کے اندر غائب ہوگئے اور سپاہی بھی کسی طرف کو سرک گئے مگر پنڈت جی ان کے نمبر دیکھ چکے تھے ....

پنڈت جی نے دونوں لڑکیوں کو اٹھا کر اپنے بازوؤں کا سہارا دیا اور شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ "گھبراؤ نہیں بیٹی .... اب تم میری پناہ میں ہو!" لڑکیاں یہ نہیں جانتی تھیں کہ ان کا بچانے والا کون ہے ..... انھوں نے پنڈت جی کی تصویر اکثر دیکھی تھی۔ مگر اس وقت ان کے حواس اس قابل نہ تھے کہ وہ انھیں پہچان سکتیں ——— مگر اپنے محافظ کے خوبصورت، پر استقلال چہرے، مہربان آواز اور مضبوط شخصیت نے ان کے دل کو یقین دلا دیا کہ خدا نے ان کی پکار سن لی اور ان کو بچانے کے لئے غیب سے کوئی فرشتہ بھیج دیا ہے۔ دونوں نے پنڈت جی کو دونوں طرف سے مضبوط پکڑ لیا۔ ان کے سروں پر دوپٹے نہیں تھے، کپڑے پھٹ گئے تھے اور وہ شرم سے زمین میں گڑی جاتی تھیں ..... پنڈت جی سہارا دے کر انھیں موٹر کی طرف لے چلے۔

ستارہ اور نجمہ پچھلے پندرہ بیس منٹ سے اپنی پوری طاقت سے دشمنوں سے لڑ رہی تھیں، اپنی مدافعت کی انتہائی کوشش میں ان کا جسم زخمی اور شل ہو چکا تھا۔ لیکن کوئی روحانی طاقت انھیں سہارا دے رہی تھی۔ جس کے بل پر وہ اتنی دیر تک چھ سات مسلح جوانوں سے لڑتی رہیں۔ اب ایک فرشتہ صورت انسان کی حفاظت میں اپنے آپ کو پاکر ان کی جسمانی قوت اور قوتِ ارادی دونوں نے جواب دے دیا ..... پہلے نجمہ بے ہوش ہو کر پنڈت جی کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔ انھوں نے اپنے دونوں ہاتھوں پر بے ہوش لڑکی

کو اٹھایا اور لاکر موٹر کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا...... ستارہ جسمانی طور پر بھی بہن سے زیادہ مضبوط تھی اور دل و دماغ پر بھی زیادہ قابو رکھتی تھی...... وہ کسی نہ کسی طرح اپنے پاؤں سے چل کر موٹر تک آئی...... ڈرائیور نے پٹ کھولا...... ستارہ گھسٹ کر موٹر میں چڑھی اور سیٹ پر بیٹھی ہی تھی کہ اس کا سر پیچھے کی طرف ڈھلک گیا...... آنکھیں بند ہوگئیں۔

پنڈت جی آگے ڈرائیور کے پاس بیٹھ گئے اور وہ تیزی سے موٹر لے کر گھر کی طرف روانہ ہوا۔

اندر دو نیم برہنہ و بے ہوش لڑکیاں بے خبر و بے حس پڑی تھیں۔ اور باہر پنڈت نہرو اپنا سر سیٹ کے گدے پر لٹکائے بیٹھے تھے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں...... دل درد و غم سے پھٹا جا رہا تھا اور دماغ روحانی کرب سے کراہ رہا تھا......

آزادی کے اس بہادر مجاہد کو جس نے اپنی ساری زندگی ملک کو آزاد کرانے کی کوشش میں صرف کر دی تھی...... جس نے تمام عمر اہنسا اور عدم تشدد کو اپنا اور اپنی قوم کا شعار بنایا تھا...... جس نے اپنی جوانی کے بہترین سال جیل کی کوٹھریوں میں کاٹے تھے تاکہ اس کے بدنصیب ملک کو غیر قوم کی غلامی سے رہائی ملے، جس نے ماں، باپ، بیوی، بیٹی، سب کی محبت کو ملک کی محبت کے لئے بھلا دیا تھا...... اپنا آرام اور آسائش خاک میں ملا دی تھی تاکہ اس کے ملک کو پھر آزادی کی فضا میں سانس لینا نصیب ہو۔ اسے وہی پرانی خوش حالی، نیک نامی، ترقی اور اخلاقی بلندی ملے جو ہزارہا سال سے اس کا طرۂ امتیاز رہی ہے...... اب آزادی ملنے کے بعد ــــــ اس کے جاہل، بدبخت اور ناشکر گزار ملک نے اپنے اس بہادر سورما کو اس کی جانبازی کے صلے میں درد و کرب کا یہ انعام عطا کیا تھا۔

نراس میں آس

تار اس کے ہاتھ سے گر گیا۔

اس کی آنکھیں بے معنی نظروں سے خلا میں گھور رہی تھیں...... معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی سوچنے سمجھنے کی قوت جواب دے چکی ہے۔ جیسے اس کا دل بے حس، اس کا دماغ مفلوج ہو گیا ہے۔

ایک آواز اس کے دماغ کے پردوں سے زور سے ٹکرائی "میں تم سے کہتا نہ تھا کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں ـــ اس زمانہ غدر میں بھلا وہ کیسے بچ سکتا تھا؟ صبر کرو یہ تو سیلاب ہے ـــ سب کچھ بہا لے جانے والا ـــ جو بچ جائے معجزہ ہے جو ختم ہو جائے اس پر تعجب نہیں ـــ مصیبت میں صبر ہی تو مومن کی پہچان ہے امتحان میں ثابت قدم رہنا ہی تو کسوٹی ہے کھوٹے کھرے کی......"

اس کے دماغ کو زور سے جھٹکا لگا ـــ اس نے آنکھیں کھول کر اپنے دوست کی طرف دیکھا، جس کا چہرہ خود ضبط غم سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں، دل درد سے پھٹنے لگا ـــ اس کا سر دوبارہ تکیہ پر گر گیا ـــ آنکھیں بند ہو گئیں اور دماغ تیزی سے کام کرنے لگا۔ روح فرسا، دل دوز، خوفناک حقیقت

اس کے سامنے آئینہ ہوگئی!

آہ اس کی آرزوؤں اور ارمانوں کا خون ہوگیا!

یوں اس طرح اس کی عمر بھر کی محنت خاک میں مل گئی؟

اس کا سارا سرمایہ ساری پونجی یوں برباد ہوگئی!

اس کے جگر پارے، دل کے ٹکڑے آگ میں جل کر راکھ ہو گئے؟

اُف ـــــ یہ بات تو کبھی اس کے خواب وخیال میں بھی نہ آئی تھی!!

دنیا میں یوں بھی ہو سکتا ہے؟ یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔

آہ......

اور گزشتہ زندگی کے سارے اہم واقعات اس کے تصور میں متحرک تصویروں کی طرح نظروں کے سامنے سے گزرتے لگے۔

"باجی زرا اس فتنی کو دیکھنا! کتنی بڑی کتاب لئے آپ پڑھنے بیٹھی ہیں"

"اے ہے لے لو نہیں تو پھاڑ دے گی"

"اوں اوں ہم تو نہیں دیتے ہم تو پڑھیں گے"

"اوہو ـــــ کیا کہنے ہیں ـــــ ابھی سے آپ شرر کے ناول پڑھیں گی، اقبال کے کلام کا مطالعہ کریں گی ـــــ بس ان کتابوں کو تم ہی تو سمجھ اور پڑھ سکتی ہو گھر میں"

"تو جھوٹ کیا ہے ـــــ دیکھ لو پڑھ نہیں رہی ہوں؟"

"ہوں تو یہ غلط فہمی ہے آپ کو کہ آپ اس کو صحیح طرح پڑھتی ہیں ـــــ

لاؤ اِدھر کتاب ۔"

"اماں جی دیکھ لیجئے یہ باجی مجھے کتاب نہیں پڑھنے دیتیں ۔"

"بیٹی تم اپنی کتاب پڑھو —— بڑے بھائی بہن کی کتابوں کا ناس نہیں کیا کرتے ۔"

"تو اماں جی میں ناس کب کر رہی ہوں، میں تو پڑھ رہی ہوں ۔"

"پڑھو ضرور پر اپنی کتابیں ۔ اپنے سبق کی ۔ یہ کتابیں جب بڑی ہو جاؤ گی تب پڑھنا ۔ لو یہ اپنی کتاب اور بہن کی کتاب اُسے دے آؤ —— شاباش ۔"

اور وہ بادل ناخواستہ منھ بنائے، تیوری چڑھائے کتاب بہن کے سامنے لیجاکر پٹخ دیتی ہے اور خود روٹھی ہو کر کسی کونے میں جاکر بیٹھ جاتی ہے ۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ کسی طرح جادو کے زور سے بڑی ہو جائے اور یہ الماری بھری کتابیں ساری کی ساری پڑھ ڈالے ۔

مولوی محمد اسمٰعیل کی کورس کی کتابوں اور محمدی بیگم کے ننھے ننھے قصوں سے اس کی پیاس نہیں بجھتی تھی ۔ اُسے جب موقع ملتا چرا چھپا کر، یا منت خوشامد سے بڑے بہن بھائیوں کی کتابیں لیتی اور انھیں پڑھنے کی کوشش کرتی ...... اُس کی پڑھنے کی قابلیت تیزی سے ترقی کر رہی تھی ۔ جو کتابیں وہ اٹھا کر پڑھنے لگتی اُس کے الفاظ کم سے کم پڑھ ضرور لیتی تھی ۔ مگر اس کا کیا علاج کہ گھر والے اس کی "قابلیت" کا لوہا نہ مانتے اور بڑی بڑی کتابیں اُسے پڑھنے کو نہ دیتے —— چوری چھپے پڑھنے سے تو اس کی پیاس اور بھڑک اٹھتی تھی اور اس کو بجھانے کی کوئی تدبیر اس کے پاس نہ تھی ۔

اور اس طرح اس کا مطالعہ —— آٹھ نو سال کی عمر میں اپنے ہم عمروں سے

بہت زیادہ وسیع ہو گیا۔

کتابیں پڑھتے پڑھتے اس کے دل میں ایک عجیب سی، انوکھی سی خواہش پیدا ہوتی !! وہ بھی کچھ لکھے...... ایسے ہی مضمون، قصّے، ناول...... اور وہ خود جھجک جاتی بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ وہ کیا جانے لکھنا ؟ یہ تو بہت بڑے بڑے، بزرگ، قابل اور لوگوں کا کام ہے ؟ اگر اس کی اس خواہش کا کسی کو علم ہو گیا تو سب کتنا مذاق اڑائیں گے ؟ کیسی ان ہونی آرزوئیں اس کے دل میں پیدا ہوتی ہیں ؟ اُسے کیا ہو گیا ہے اللہ میاں ؟

کاش وہ کسی طرح جلدی سے بڑی ہو جائے، بہت قابل ہو جائے اور پھر پھر — وہ کتابیں لکھ لکھ کر ڈھیر لگا دے...... ہر طرف اس کا چرچا ہو ہر شخص اس کا ذکر کرے — ارے اس نے — اس لڑکی نے اتنی بہت سی ایسی اچھی اچھی کتابیں لکھی ہیں ؟" اور وہ تخیل میں اُس عزت و شہرت کا لطف اٹھایا کرتی جو اُسے ان کتابوں کی تصنیف کے بعد حاصل ہوئی تھی۔

شرر اور سرشار، سجاد حسین اور رسوا کے ناول اگر کسی طرح اس کے ہاتھ بھی لگ جاتے اور وہ انھیں پڑھ ڈالتی تب بھی اُس کو تسکین نہ ہوتی تھی۔ اس لئے کہ اپنی کم عمری، ناسمجھی اور کچی عقل کے باعث نہ تو وہ عشق و عاشقی کے ان فرضی رومانوں کو سمجھ سکتی تھی جو ان کتابوں پر چھائے ہوئے ہیں، نہ شجاعت و بہادری کے ان کارناموں کو عقل قبول کرتی تھی جو ان کتابوں کے ہیرو انجام دیتے تھے اور نہ وہ اُس بامحاورہ اور چٹخارہ دار زبان سے لُطف اٹھا سکتی تھی جو ان کتابوں کی جان ہے — وہ ان کو پڑھ کر سوچا کرتی یہ کیا بات ہوئی ؟ اس کا کیا مطلب ؟ یہ کیسے ہو گیا ؟ ایسا کس طرح ہو سکتا ہے ؟ لیکن کوئی نہ تھا جو اس کے

لاتعداد سوالوں میں سے دو چار کا بھی شافی جواب دے کر اس کی کچھ تسکین کر سکتا۔

اور جب کچھ عرصے بعد اُس کے گھر میں خواتین کے لکھے ہوئے کئی ناول منگائے گئے تو اُسے کتنی خوشی حاصل ہوئی؟ ان میں ہندوستانی گھریلو معاشرت کی تصویریں، عورتوں کی روزمرہ زبان، بچوں اور لڑکیوں کا ذکر اُس کو بڑا اچھا لگتا۔ ہر کتاب کی ہیروئن کی جگہ وہ اپنے آپ کو رکھتی اور دل ہی دل میں اس کا لطف اٹھاتی ـــــ اکثر ایسا ہوتا کہ سوچتے سوچتے یہ خیالی ہیروئن ایک نیا پلاٹ، نیا قصہ اپنے گرد تعمیر کر لیتی ـــــ اور پھر وہ یکایک چونک پڑتی ـــــ ارے! یہ کیا!! کتاب میں تو ایسا نہ تھا؟ پھر کیا یہ سارا قصہ اس نے اپنے دل سے بنا لیا؟ تو کیا وہ خود بھی اس طرح قصے بنا سکتی ہے؟

اور آخر دل کی چٹک سے مجبور ہو کر اس نے چھپ چھپ کر، اپنی دھندلی گھسی ہوئی پنسل اور پرانی کاپی پر قصے لکھنے شروع کر دیے۔ وہ کھیل کود، گڑیوں، آنکھ مچولی وغیرہ سے وقت بچاتی اور کسی جگہ چھپ کر سنے اور پڑھے ہوئے قصوں جیسے قصے تصنیف کرتی، حسین و جمیل، قابل، ذہین، رئیس اور شاندار کردار تخلیق کرتی۔ کیا ہوا اگر اس کے گرد و پیش یہ ماحول نہیں ہے؟ اس کے تخیل میں تو ایسے ہی نادر روزگار افراد بس سکتے ہیں جیسے اُن قصوں میں ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ اچھے حسن و جمال کی دولت سے مالا مال، زیور و جواہرات، زربفت کمخواب سے آراستہ، علم و ہنر سے پیراستہ ـــــ اور یہ قابل قدر کردار اس کی کسی ٹوٹی صندوقچی، کسی پرانی تھیلی میں چھپے پڑے رہتے کہیں کوئی انھیں دیکھ نہ لے ـــــ اُن کے وجود سے باخبر نہ ہو جائے؟ اُسے بے حد ڈر لگتا تھا کہ اگر اس کے ہمسنوں کو خبر ہو گئی تو وہ اُسے ستائیں گے مذاق اڑائیں گے اور "بڑوں" سے کہہ دیں گے جانے پھر کیا ہو؟

لیکن آخر ایک دن اُن کی ہستی کا علم گھر والوں کو ہو ہی گیا!

اوہ ــــ کتنا سخت تھا اس کے لئے وہ دن؟

اس کے ہمجولیوں نے عین موقع واردات پر اس کو گرفتار کرلیا اور اس کی عزیز از جان کاپی اس سے چھین لی اور زور زور سے سب کے سامنے پڑھنے اور اُسے چڑانے لگے بڑے بہن بھائی طنز سے ہنس رہے تھے، بزرگ زیر لب اس کی حماقت پر مسکرا رہے تھے اور ہمجولی قہقہے لگا رہے تھے ....

"اوہ ...... افوہ ــــ سنا چچی اماں آپ نے اب تو یہ بڑی بھاری مصنفہ بن گئی ہیں ..... زرا سنئے گا باجی، اس کی ہرن جیسی سیاہ حسین آنکھوں سے موتیوں جیسے آنسو گر رہے تھے۔"

"ارے بھئی اب کیا ہے ــــ اب تو ہم جیسے گھٹیا لوگوں کو منھ بھی نہیں لگائے گی! یہ ٹھہریں ادیبہ ــــ مصنفہ ــــ ناول نگار ...... اور ہم بچارے جاہل ..."

"اور یہ بھی سنا آپ نے؟ ہیروئن صاحبہ نے تیرہ سال کی عمر میں بی۔ اے پاس کر لیا ــــ اُف میرا تو ہنستے ہنستے پیٹ دُکھنے لگا ......"

"یہ گئی کہاں؟ زرا بلاؤ تو ــــ میں بھی تو اپنی مصنفہ بیٹی کی صورت دیکھوں۔"

"اماں مصنفہ تو سمردری میں چھپی رو رہی ہیں کہ ان کی پردہ دار رداتی کو بے پردہ کیوں کیا گیا۔"

دس گیارہ سال کی ادیبہ کو اس ہنسی مذاق کے سوا اور توقع بھی کیا کرنی چاہئے تھی؟ اور جب کہ اس کی گھر میں یوں بھی کوئی اہم حیثیت نہ تھی۔ مگر اُسے تو یہ اپنی انتہائی

ہتک محسوس ہو رہی تھی۔ گھر والوں کی سنگ دلی اور بے حسی نے اس کا دل توڑ دیا تھا اُف اس کے قابلِ فخر و قابلِ قدر کارناموں کا یہ انعام؟ اوہ —— دنیا کتنی ناقدری کتنی بے درد ہے؟ ایک طرف اس کا دل درد و غم سے پھٹا جاتا تھا اور دوسری طرف شرم اور ندامت سے بزرگوں کے سامنے جاتے نہ بنتا تھا۔

اس نے جھنجھلا کر کاپی چھین لی اور خود اپنے ہاتھوں اپنے سب "لختِ جگر" فنا کے گھاٹ اتار دیئے .... اور کتنی دیر وہ ان کے غم میں روتی رہی۔ اس نے دل میں عہد کیا کہ وہ اب کبھی کچھ نہ لکھے گی۔ ہائے اس کی "عمر بھر" کی محنت برباد ہو گئی۔ اور یہ سوچ کر اس کی آنکھیں اور تیزی سے برسنے لگیں۔

خوش نصیبی سے گھر میں اس کا ایک ہمدرد پیدا ہو گیا جس نے اس الھڑ، کم سن، ناتجربہ کار، کم عقل لڑکی کی اس جرأت کا مضحکہ نہیں اڑایا بلکہ اس کی ہمت افزائی اور رہبری کی۔ اس کی ڈھارس بندھائی۔ غالباً اس کی نکتہ شناس نظر نے یہ بھانپ لیا کہ وہ فطرت کی طرف سے ادبی ذوق لے کر پیدا ہوئی ہے اور شاید باوجود لڑکی ہونے کے اس کو اپنے باپ کی بے نظیر تصنیف و تالیف کی قابلیت ہی سے ورثہ ملا ہو!

اور اُسی زمانے میں منشی پریم چند، مختصر اردو افسانے کے خالق، آسمانِ ادب پر نیرِ تاباں بن کر نمودار ہوئے اور اس کی جوت سے اس کا گھر بھی منور ہوا۔ وہ بار بار ان کے افسانے پڑھتی، سنتی مگر اُسے سیری نہیں ہوتی تھی۔ شرر اور سرشار کو سمجھنا اُس کے لئے مشکل تھا، خواتین کے ناولوں کے کرداروں کی قابلیت اور حسن و جمال و دولت و ثروت اُسے عجیب اور غیرِ فطری سی محسوس ہوا کرتی تھی۔ لیکن پریم چند کی

آسان زبان، سیدھا سادا طرزِ بیان، تصنع سے پاک حقیقی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں کردار۔ دل کی سچائی اور سادگی آمیز پراثر شخصیت اُسے مسحور کرلیتی تھی۔ جس چیز کی تلاش میں اس کی روح بھٹک رہی تھی وہ جیسے اس نے پالی اور غیر محسوس طور پر اس کے خیالات پر ان کا گہرا اثر چھا گیا۔

ایک مخلص ہمدرد مشیر، اور ایک ذہنی رہبر ملنے کے بعد اُس کی جھوٹی شرم اور بے جا جھجک کم ہونے لگی۔ خود اعتمادی اور جرأت کا جذبہ ابھرا، بے بضاعتی اور کم مائگی کا خیال کم ہونے لگا اور اپنے بدصورت شکستہ خط، اور کم سنی اور کم علمی کے باوجود اس نے زور و شور سے لکھنا شروع کر دیا۔ ہم سنوں کی چھیڑ چھاڑ، بزرگوں کا ہنسی مذاق اب اس کا دل نہیں دُکھاتا تھا بلکہ اس سے اُس کی آتشِ شوق اور بھڑک اٹھتی تھی "دیکھنا ایک دن ایسا آئے گا کہ یہی لوگ حیرت اور تعجب اور تعریف کے ساتھ میری چیزیں پڑھا کرینگے،" وہ اپنے دل میں کہا کرتی۔

وہ بڑھتی رہی، اس کا مطالعہ بڑھتا رہا، لکھنے کا شوق بھی بڑھتا گیا اور مشق بھی، جب بھی اس پر کوئی جذبہ اثر کرتا وہ دل کی بھڑاس صفحہ کاغذ پر نکال لیتی۔ وہ رنج و صدمے سے شکستہ دل ہوتی یا غم و غصے سے بے حال، خوشی و مسرت سے بھرپور ہوتی یا ناکامی اور بے لبسی سے افسردہ و دل برداشتہ، ان سب کو سہنے کے لئے ایک سہارا اس کے پاس تھا۔ ان سے مقابلے کے لئے ایک ہتھیار کی مالک تھی ...... اس کا قلم اُس کے ہاتھ میں تھا ــــــ اور اس طرح اس کے پاس کاپیوں اور کاغذوں کے ڈھیر جمع ہوگئے

اگر کوئی اسے سمجھنا چاہتا، اس کے دُکھ درد کو، اس کی خواہشوں اور آرزوؤں کو معلوم کرنا چاہتا تو اُسے ان کاغذوں سے بہت مدد ملتی ــــــ لیکن کسی نے یہ تکلیف گوارا نہ کی

ہاں خود اسے اپنی شخصیت کی تعمیر میں اس سے بہت مدد ملی ــــــ اور اب وہ اپنے اس شوق کو کسی قیمت پر ہاتھ سے دینے کو تیار نہ تھی۔

اور پھر اس کے مضمون اور افسانے زنانے اخبار رسالوں میں چھپنے لگے .... اور اس وقت کی اس کی مسرت!!! اُسے کون سمجھ سکتا ہے؟ رفتہ رفتہ ان کی مانگ بڑھنے لگی ان کی قدر ہونے لگی۔ وہ "بزعم خود" اصلاحی افسانے، معاشرتی قصے وغیرہ لکھ کر "ادب" کی خدمت کر رہی تھی ــــــ اس کی کوشش یقیناً یہی تھی لیکن اس کی تہ میں شاید سب سے زبردست اور گہرا جذبہ یہ تھا کہ وہ اپنی خودی کو تسکین دے سکے۔ خود پسندی کے جذبے کو آسودہ کر سکے۔ اب وہ اپنے کو بڑی "ادیبہ" اور "مضمون نگار" سمجھنے لگی تھی!

اور پھر اس کی زندگی میں انقلاب آیا۔

اس نے عملی دنیا میں قدم رکھا۔

اس کی شادی ہو گئی .... ایک مستند اور پختہ کار ادیب کے ساتھ۔

اس کا ذوقِ ادب اور شوقِ تصنیف شاید زندگی کی نئی دلچسپیوں اور ذمہ داریوں میں پھنس کر ختم ہو جاتا۔ مگر ہم مذاق اور ہم خیال ساتھی کی، رفاقت نے اُسے اس ذہنی موت سے بچا لیا۔ اس کا شوق کم ہونے کے بجائے اور بڑھنے لگا۔

اُس نے اپنے مطالعے کو وسیع کرنے، اپنی مشق کو بڑھانے کے لئے نئے منصوبے

بنائے اور ان کو پورا کرنے کی کوشش کرنے لگی ۔

مگر افسوس!

جوں جوں اس کا مطالعہ وسیع ہوا ، اس کی قوتِ تنقید بڑھی اُسے اپنی کم مائگی اور بے بضاعتی کا احساس بڑھتا گیا۔ قابل قدر ادیبہ و مصنفہ ہونے کا زعم ختم ہو گیا اور ایک نومشق شوقین لکھنے والی کے سوا اپنی اور کوئی حیثیت اسے اردو ادب میں نظر نہ آتی تھی۔ اعلیٰ پائے کے ادیبوں کی تصانیف اور شہ پاروں کے سامنے اُسے اپنی چیزیں اتنی گھٹیا اس قدر ناکارہ معلوم ہوتیں کہ شرم سے اس کا سر جھک جاتا، دل ندامت اور رنج سے لبریز ہو جاتا!

ممکن تھا کہ یہ احساسِ ندامت و کم مائگی اُسے ہمیشہ کے لئے قلم سے دست بردار کر دیتا لیکن اس کے ساتھی نے اُسے بد دل ہونے سے بچا لیا۔ اس کے ذاتی جوہر کی قدر دانی کی، اس کے شوق کو سراہا، اس کو مدد اور مشورہ دینے کا وعدہ کیا اور اس کی ہمت بڑھائی اس سہارے نے اُسے تقویت دی۔ اس کا ٹوٹا ہوا حوصلہ بندھا اور ایک مرتبہ پھر اس نے کوشش کرنے کا عزم کر لیا اور دل وجان سے اس میں منہمک ہو گئی۔

وہ بڑے شوق اور لگن کے ساتھ اپنی مشق، اپنی قابلیت اور مطالعہ بڑھا رہی تھی کہ ایک اور چکر نے اس کے خیالات منتشر کر دئے۔

اُسے پتہ چلا کہ وہ اب ادبی تخلیق کی جگہ —— حقیقی تخلیق کر رہی ہے۔

مسرت وخوف، امید وبیم کے متضاد جذبات سے اس کا دل کانپ اٹھا۔

وہ ہمیشہ سے یہ سمجھتی آئی تھی کہ اسے بچوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ——

اس کی دلچسپی کا اصلی مرکز اس کی تحریریں ہیں جنھیں وہ جان سے زیادہ چاہتی ہے۔

اُسے اب پتہ چلا کہ یہ خیال اس کی ناتجربہ کاری پر مبنی تھا!

وہ عورت کی فطرت سے ناواقف تھی!

اب اسے اپنی، عورت کی، جبلت حقیقی رنگ میں نظر آئی۔

عورت، شاعر ہو یا ادیب، سیاست داں ہو یا سائنس داں، معلم ہو یا لیڈر ...... ہر حال میں عورت ہے ... بچوں کی دلدادہ ماں بننے کی آرزومند!!

ادیبہ و مصنفہ ہونے کے باوجود بچے کی خواہش اور محبت اس کے دل میں بھی اُسی شدت کے ساتھ جلوہ فگن ہے! وہ دوسری عورتوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں!

اس کا دھیان خیالی افسانوں، فرضی کرداروں کی طرف سے ہٹ گیا اب اُس کا جسم اور روح دونوں حقیقی انسانوں کی تخلیق میں محو تھے۔

اُس کے دن اور رات اور ہی قسم کے خیالات میں گزرنے لگے۔ اُس ننھے منے انسان کے تصور میں جو ابھی عالم وجود میں آیا بھی نہیں تھا۔ وہ اس کی پرورش اور تربیت کے منصوبے بناتی۔ اس کی سیرت کی تشکیل کرتی۔ اس کی کامیاب زندگی، شاندار مستقبل کی تصویریں تخیل کے سہارے وہ بڑی آسانی سے دیکھتی رہتی تھی۔

ادب کی پرستار، ادبی ذوق سے سرشار ادیبہ اب صرف ماں تھی!

اس کی ذات کا ہر ہر جُز، اس کے تخیل کی ہر پرواز، اُس کے دماغ کی ہر فکر، دل کا ہر احساس، اُس کے ساز زندگی کا ہر تار ...... ہونے والے بچے کے لئے وقف ہو چکا تھا۔

وہ اپنا شاہکار تصنیف کر رہی تھی!!

وہ تخیل کے پروں پر اڑتی سہانے سپنے دیکھ رہی تھی۔ امیدوں اور آرزوؤں سے لبریز دنیائیں بنا رہی تھی! بڑے خوبصورت اور دلکش افسانے اپنے اس ننھے ہیرو کے گرد تصنیف کر رہی تھی۔ اور اس کردار کو جو ابھی تک فرضی اور تخیلی تھا، عالمِ وجود میں لانے اور امر بنانے کے لئے وہ اپنی جان تک کو بے حقیقت سمجھ رہی تھی۔

وہ عورت کی زندگی کے سب سے شیریں، سب سے پیارے، سب سے خوبصورت لمحہ کی منتظر تھی ——— اس لمحہ کی جب عورت فخر و مسرت کے انتہائی جذبات کے ساتھ اپنی سب سے پہلی تصنیف پر نظر ڈالتی ہے...... اس کی ہستی کو دیکھتی ہے جس کو وہ جُزو کُل اپنا سمجھتی ہے، جس کی شخصیت اور کردار میں وہ اپنی شخصیت اور کردار کو گُم کر کے اپنی خودی کا جلوہ دکھاتی، اپنی ذات کا اثبات کرتی ہے۔

وہ اپنے دماغ کی پرواز کے ہاتھوں عاجز تھی!

تخیل اُسے کیا کیا دکھا رہا تھا ——— کیسے کیسے حسین خواب!

لیکن......

عین اُس وقت جب وہ اُس پُر مسرت اور خوبصورت لمحے کی منتظر تھی اُسے زندگی کا تلخ ترین گھونٹ پینا پڑا ——— دل شکن، روح فرسا، المناک حقیقت سے دوچار ہونا پڑا ——— اُس المیہ کو دیکھنا پڑا جو عورت کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔

وہ ماں بنی ———————

پژمردہ بچے کی!!

اُس کے دل پر جو کچھ بیتی ——— اُسے اس کے سوا کوئی نہ جان سکا۔

وہ خاموش رہی ۔ اُس نے منہ سے بچے کا ذکر نہیں کیا ــــــ آنکھ سے آنسو نہیں نکلنے دیا، تیوری پر بل نہیں آنے دیا ۔

دنیا اس دھوکے میں رہی کہ نوجوان الھڑ ماں کو بچے کا کچھ زیادہ صدمہ نہیں ہوا ــــــ ہوتا بھی کیا ؟ پہلے بچے کا چاڈ اور صدمہ دونوں بزرگوں کو ہوتا ہے ماں کے لئے تو ایک طرح سے اچھا ہی ہوا ۔ کم سنی میں بچے کے پالنے پوسنے کی مصیبت سے بچ گئی !

کاش ــــــ اے کاش ــــــ وہ اسی قسم کی ماں ہوتی !!

کاش اس نے گذشتہ چھ ماہ میں آرزوؤں اور تمناؤں کی اتنی دنیا ئیں نہ بنائی ہوتیں، اُس کے ننھے ہیرو کی شخصیت اتنی دلکش، ایسی زبردست، اُس کا کردار اتنا مضبوط ، اس کی سیرت اتنی حسین نہ ہوتی ۔ کاش اُس کے ہیرو نے قوم اور ملک کی قابلِ قدر اور مفید خدمات انجام نہ دی ہوتیں جن کے تصور سے اس کا سر فخر و ناز سے بلند ہو جاتا تھا ۔

آہ !

کاش اس کی حس اتنی تیز، اس کی محبت اتنی گہری نہ ہوتی !

کاش اے کاش ــــــ اس کا تخیل اتنا زبردست نہ ہوتا !

وہ ایک معمولی عورت ، سیدھی سادی ماں ہوتی جو چار دن بچے کی موت پر رو کر اُسے ہمیشہ کے لئے صبر کر لیتی ــــــ

کاش ــــــ کاش ــــــ

رنج و غم اور مسلسل بیماریوں نے اسے سالہا سال لپیٹ رکھا۔ اس کی صحت برباد ہو گئی، جسم کمزور پڑ گیا اور اس نعمت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہونے کے غم نے، جس کے لئے اس کی روح بے قرار تھی، اسے کچل سا دیا۔ تصنیف و تالیف کا شوق ٹھنڈا پڑ گیا — ادبی دنیا میں نام پانے کی خواہش مر سی گئی۔ بس اس کی قسمت میں یہی ہے کہ عمر بھر بیماریوں کی آؤ بھگت کرے، اور بقیہ زندگی کسی نہ کسی طرح بے مقصد اور بے کار طریقے سے بسر کر دے جیسی اور ہزاروں ہندوستانی عورتیں کرتی ہیں۔

مگر ————

خدا کی رحمت اور اپنے دوست کی ہمدردی اور رہبری کی بدولت وہ مایوسی اور بے عملی کی لعنت کا شکار ہونے سے بچ گئی۔

اُس نے وہ گُر معلوم کر لیا جو اس کی زندگی کا مقصد، اُس کے زخم کا مرہم، اس کے دل کے لئے طمانیت اور روح کے لئے سکون ثابت ہوا!

اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے حوصلے کو پست نہ ہونے دیگی۔ وہ ادبی خدمت کرنا نہ چھوڑے گی۔ اپنے شوق کو جاری رکھے گی۔ پہلے اگر وہ محض دلچسپی کے لئے لکھتی تھی، شہرت کی خواہش، خود نمائی کے شوق، اور نام آوری کی آرزو کے لئے لکھتی تھی تو اب اس کا مقصد اس سے بلند ہوگا...... جتنی بھی اس کی استعداد ہے، جیسی بھی اُس میں صلاحیت اور جس قدر قابلیت ہے اس کے مطابق وہ اپنا مقصد اولیٰ ادب کے ذریعے انسانیت کی خدمت کرنا سمجھے گی —— وہ خدمت کرے گی —— انسانوں کی، انسانیت کی —— کہ یہی ایک عورت کی —— خصوصاً ادیب عورت کی زندگی کا بلند ترین مقصد ہونا چاہیے اور وہ دل و جان سے اس مقصد کے حصول میں کوشاں ہو گئی۔

اس کے بہت سے فرائض، بہت سی ذمہ داریاں، بہت سی دلچسپیاں تھیں۔ اور وہ حتی المقدور ان سب کو پورا بھی کرتی تھی۔ اس کی زندگی میں بہت سی مشکلات اور پریشانیاں تھیں جن سے وہ عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔

لیکن ان سب فرائض، سب ذمہ داریوں کو انجام دیتے وقت بھی اس کے دل و دماغ پر ایک ہی جذبہ طاری رہتا —— وہ ادب کی خادم ہے —— اس کا اصلی کام ادب کی خدمت کرنا ہے۔

اور اس کی روح کی پیاس اُسی وقت بجھتی جب وہ اپنے اس مقصد حیات، اس محبوب شغل میں مصروف ہوتی۔

بیماریوں کی مصیبت، گھریلو مصروفیات، خاندانی جھگڑے قصے، مالی پریشانیاں وقت کی کمی، یہ سب اس کے راستے میں روڑے اٹکاتے —— بدقسمتی سے وہ عورت تھی اور ہندوستانی عورت —— جس کے لئے اور سب کاموں سے آزاد ہوکر اپنے کسی خاص مقصد کی تکمیل ناممکن ہے —— لیکن وہ کسی نہ کسی طرح ان سب رکاوٹوں کو تھوڑا بہت ہٹاکر، اپنے کام کے لئے وقت نکال ہی لیتی۔

اس نئی لگن اور مقصد نے اس کی زندگی کا رُخ پلٹ دیا۔

زندگی کے وہ صدمات، وہ تلخیاں جنھیں وہ پہلے قدرت کا ظلم اور ناانصافی سمجھتی تھی اب اُسے خدا کی رحمت اور فطرت کا دیا ہوا سبق معلوم ہوتے تھے۔

اگر بچپن سے اس نے رنج اور صدمے نہ اٹھائے ہوتے تو اُسے دوسروں کے غم کا احساس نہ ہوتا!

اگر اُسے مشکلات اور پریشانیاں پڑتیں تو وہ دوسروں کی حالت کیسے سمجھ

سکتی تھی ؟

اگر اُسے تنگی کی جگہہ مالی فراغت حاصل ہوتی تو وہ دوسرے غریبوں کی حالت کو نہیں محسوس کر سکتی تھی ۔

اگر اسے بیماریوں سے دوچار نہ ہونا پڑتا تو وہ مریضوں کے دُکھ کو پوری طرح کیسے جان سکتی تھی ؟

اگر وہ اور ہزاروں، لاکھوں عورتوں کی طرح بال بچوں میں گھر گئی ہوتی تو وہ ادبی خدمت نہیں کر سکتی تھی ۔

اور اگر وہ ماں بنی ہی نہ ہوتی تو اس کے دل میں وہ لوچ، وہ گداز، وہ سوز نہ پیدا ہو سکتا جو اس غم کی بدولت اسے حاصل ہوا ہے ——— وہ داغ جس نے اس کے دل کو روشن کیا، جس نے اُسے دوسری دُکھی ماؤں کے درد و غم کو سمجھنا سکھایا، جس نے اُسے شدت احساس کی نعمت عطا کی کہاں ہوتا ؟ وہ شاید سخت دل، بے حس، دل برداشتہ اور ناشکر گزار عورت ہوتی جسے اس کا شکوہ ہوتا کہ وہ زندگی کی سب سے بڑی نعمت سے محروم ہے، وہ روکھی اور کھری ہوتی، اپنا غم سمجھتی مگر دوسروں کا درد نہ محسوس کر سکتی ۔ جو کسی ادیب کی سب سے بڑی ناکامی، سب سے بڑی محرومی ہو سکتی ہے ——— وہ ان لطیف احساسات اور جذبات سے بیگانہ رہتی جو ایک ماں ——— ایک مردہ بچے کی ماں کے دل ہی میں پیدا ہو سکتے ہیں ۔

کون کہتا ہے قدرت ناانصاف ہے ؟

اس سے ایک نعمت چھین لی گئی لیکن بدلے میں اُسے کتنی بڑی دولت ملی ہے !

کئی سال گزر گئے۔

وہ لکھتی رہی ——— برابر ——— شوق اور لگن سے۔

اس کے مضامین، افسانے، اُس کے ناول کے متفرق باب ادبی رسالوں میں قدر کے ساتھ شائع ہوتے رہے۔

اس نے اپنی کئی کتابیں اشاعت کے لئے مرتب کیں۔

افسانوں کا مجموعہ۔

مضمونوں کا مجموعہ۔

بچوں کی کہانیوں کی کتابیں۔

ناول۔

لیکن کاغذ کی نایابی، کتابت وطباعت کی مشکلات جنگ کی برکات میں سے تھیں۔ اس کی مرتبہ کتابیں اشاعت کی منتظر پڑی رہیں۔ ان کا حجم بڑھتا گیا۔ اور اس کا دل روز بروز اس کو چھپوانے کے لئے زیادہ بے قرار ہوتا گیا۔

اس نے مالی مشکلات کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔

اپنا زیور بیچ دیا ——— اپنی جو تھوڑی سی جائداد تھی وہ بھی فروخت کر دی۔

روپیہ کتابوں کی اشاعت میں لگا دیا۔

انتظار ———

انتظار ——— موت سے زیادہ سخت انتظار ———

کاتبوں کی کاہلی،

چھاپے خانوں کی وعدہ خلافیاں،

ناشروں کے نخرے،

وہ سہتی رہی اور انتظار کرتی رہی۔

کبھی تو اس کی آرزو پوری ہو گی؟ کبھی تو یہ انتظار کی مدت ختم ہوگی؟ اور اس کی کتابیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر اس کے سامنے آئیں گی۔

کبھی کبھی اُسے حیرت ہوتی آخر وہ اتنی بے قرار کیوں ہے؟ کتاب چھپنے سے کیا فرق پڑ جاتا ہے؟ چھپے نہ چھپے اس کا کام تو لکھنا ہے .... لیکن ان خیالات سے وہ اپنے کو تسکین نہیں دے سکتی تھی۔ وہ اس ماں کی طرح بے قرار تھی جس کے بچے بہت دور تکمیلِ تعلیم کے لئے گئے ہوئے ہوں اور ماں اس کی منتظر ہو کہ کب وہ آ کر اس کے دل کو ٹھنڈک پہنچائیں گے؟ کب وہ ان کے دیدار سے اپنے بے چین دل کو تسکین دے سکے گی؟ کب ترسی آنکھوں کی پیاس بجھے گی؟

اور آخرکار اس کی کتابیں چھپ گئیں!

پانچ نئی تصانیف۔

فخر و مسرت سے اس کا سر بلند ہو گیا؟

خوف و انکسار کے جذبات سے اس کا دل کانپ گیا!

جانے اس کی یہ ناچیز تصانیف ادبی حلقے میں کس نظر سے دیکھی جائیں گی؟

قدر کی یا حقارت کی؟

نہ جانے یہ کتابیں اس کے مقصدِ اعلیٰ، خدمتِ انسانیت کے معیار پر کس حد تک پوری اتریں؟

مگر.... اس کے دل کو اتنا اطمینان ضرور تھا کہ اس نے ایمانداری اور محنت کے ساتھ کوشش کی ہے ـــــ اور محنت کو راحت، کوشش کو کامیابی حاصل ہوتی ہے ان میں جو نقائص، جو کمزوریاں، جو کمیاں ہوں گی ـــــ انھیں وہ آئندہ دور کرنے کی کوشش کرے گی ـــــ اسی طرح زینہ بہ زینہ ہی تو انسان بام بلند پر پہنچتا ہے!!

وہ اپنی چھ کتابیں، اپنی کتابوں کی الماری کے ایک خانے میں برابر برابر رکھ رہی تھی اور اس کا چہرہ مسرت سے چمک رہا تھا کہ اس کی ایک دوست نے ہنس کر اس سے کہا "ماشاء اللہ" اب تو بہت سی کتابیں ہوگئیں تمھاری ـــــ" اللہ کرے زور قلم اور زیادہ" تو اس نے کس طرح خوشی سے بے خود ہو کر جواب دیا تھا ـــــ "انشاء اللہ" ابھی تو یہ پورا خانہ بھرنا ہے بہن ـــــ اگر زندگی رہی"

"انشاء اللہ"

اب اُسے ان پرانے خیال کی ہمدرد عورتوں کی باتوں پر ہنسی آیا کرتی! جو خدا سے دعا مانگا کرتیں خدا اس "بچاری" کو ایک بچہ دے دے!

جو اس کی بدنصیبی پر دل میں یا چپکے چپکے آپس میں اظہار رنج و افسوس کرتیں۔ کہ یہ بچاری اتنی بڑی نعمت سے محروم ہے۔

اور وہ دل ہی دل میں مسکراتی!

بچاری قدامت پرست عورتیں ـــــ انجان، بے خبر عورتیں!

وہ کچھ نہیں جانتیں، کچھ نہیں سمجھتیں۔ انھیں کیا معلوم؟

اُس کے تو بہت سے بچے ہیں!

آخر اس کی یہ ساری تصانیف اس کی اولاد نہیں تو کیا ہیں؟

اولاد سے آخر ماں کیا توقع کرتی ہے نام چلنے کی؟ کیا اس تصانیف اس کا نام باقی نہ رکھیں گی؟ رفاقت کی؟ کیا کتابوں سے بڑھ کر کوئی رفیق ہو سکتا ہے؟ بڑھاپے اور مصیبت میں دستگیری کی؟ مالی منفعت کی؟ کیا اس کی کتابیں اُسے یہ فائدہ نہیں پہنچا سکتیں؟

کیا اس لئے کہ نیک اور سعادت مند اولاد ماں کی شہرت اور عزت کا باعث ہوتی ہے؟

تو کیا اس کی یہ اولادِ معنوی اگر قدر کے قابل ہوئی تو اُسے عزت و شہرت سے مالامال نہیں کر سکتی؟

پھر آخر وہ کیوں اپنے کو محروم اور بدنصیب سمجھے؟

لیکن جس طرح ماں بچوں کی تخلیق اور پرورش بغیر اس قسم کے خیالات اور اغراض کے صرف فطری محبت سے ہو کر کرتی ہے، اس وقت کوئی ذاتی غرض، کوئی خود غرضی کا خیال اس کے دل میں نہیں رہتا ـــــ محض فطرت اور محبت اس کی محرک ہوتی ہے ـــــ اس بے غرض جذبے کے تحت، اپنے فطری شوق، دلی اُمنگ سے مجبور ہو کر وہ اپنی ذہنی اور دماغی اولاد کی تخلیق کیا کرتی تھی ـــــ اُسے اس سے وہی پچی روحانی مسرت ملتی جو کسی ماں کو اپنے چہیتے بچے کی پرورش میں اس کے لئے تکلیف اٹھا کر، اس کے لئے اپنے کو تج کر حاصل ہوتی ہے ـــــ اس نے اپنی معنوی اولاد کو اصلی اور حقیقی بچوں کی جگہ دے دی تھی!!

وہ بہت خوش تھی، بے حد مسرور، اپنی قسمت پر نازاں!

اس کی چھ کتابیں چھپ چکی تھیں،
چار کتابیں پبلشرز کے پاس تھیں ...... اس کے تازہ افسانوں کا مجموعہ
مرتب ہو رہا تھا،
اس کا نیا ناول مکمل ہونے کے قریب تھا۔
اسی سال کے اندر اندر اس کی تصانیف درجن بھر ہو جائیں گی؟
اس کا نام ادبی دنیا میں تعارف کا محتاج نہ رہے گا!
ادبی حلقے میں اس کی کتابیں جس نظر سے دیکھی گئیں اُس نے اُسے مایوس
نہیں کیا۔
وہ پھر تخیل کے پروں پر اڑ رہی تھی!
پھر شیریں و سہانے خواب دیکھ رہی تھی!
مستقبل، شاندار —— پر مسرت —— مستقبل اس کا منتظر تھا!!

گرمیوں کا زمانہ تھا —— وہ دہلی سے بہت دور اپنے چند عزیزوں کے ہاں
چھٹیوں کے دن آرام سے بسر کرنے گئی ہوئی تھی۔
اس کی صحت بحال، دماغ حاضر، تخیل کی پرواز زوردار، دل مطمئن اور جی
خوش تھا۔
آمد ہی آمد تھی۔ ہر وقت نئی نئی باتیں، نئے نئے پلاٹ اس کے دماغ میں
گھوما کرتے۔ بچوں کی کئی کہانیاں اُس نے لکھ ڈالی اور ایک ضخیم ناول مکمل ہونے کے
قریب تھا۔

وہ سالہا سال سے اُس سکون و اطمینان سے محروم تھی جس کی اُسے اپنی ادبی مصروفیات کے لئے ضرورت تھی۔ لیکن اب وہ اُسے میسر تھا اور وہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہی تھی۔

اور ۱۵ اگست کو ہندوستان آزاد ہو گیا!

پنجاب کے خوفناک اور دلدوز واقعات اگرچہ دل شکن اور پریشان کن تھے پھر بھی سارے ہندوستان میں مسرت و جوش کی ایک لہر دوڑ گئی، کروڑوں آدمی خوشی سے بدحواس تھے ——— اور وہ اپنے ملک کی آزادی کی خوشی میں ان کی برابر کی شریک تھی۔

ہندوستان کے اور بہت سے لوگوں کی طرح اس کا بھی یہ خیال تھا کہ آزادی ملنے کے بعد اپنے اپنے مطالبوں کے پورے ہونے کے بعد ظلم و فساد کی یہ آگ ٹھنڈی پڑ جائے گی۔

اُس کا ملک اب آزاد تھا!

اوہ ———

اُسے کبھی یہ امید نہ تھی کہ وہ اپنی زندگی میں یہ مبارک دن دیکھے گی۔

کتنی بڑی خوش نصیبی!

یوم آزادی کو ہر طرف خوشی اور مسرت چھائی ہوئی تھی ——— وہ دلی مسرت جوش اور شدتِ احساس سے مغلوب ہو گئی اور اس نے کئی گھنٹے بیٹھ کر یوم آزادی پر ایک مضمون لکھ ڈالا ——— اس کی وہ بچپن کی عادت اب تک قائم تھی کہ جو جذبہ اس کے

دل پر گہرا اثر کرتا وہ اسے قلمبند کرنے پر مجبور ہو جاتی۔

اب وہ آزاد ملک کی آزاد عورت ہے ——— اب وہ اور زیادہ خوش دلی اور جوش اور آزادی کے ساتھ کام کر سکتی ہے۔

جانے وہ کیا کیا منصوبے بناتی رہی……

لیکن آہ!

ستمبر میں دہلی کے اسٹیج پر جو خونیں ڈراما کھیلا گیا ——— اس نے اس کی ساری امیدیں، ساری آرزوئیں، ساری امنگیں، خاک میں ملا دیں، سب خوشیاں پامال کر دیں ——— سارا جوش ٹھنڈا کر دیا۔

بدبخت دہلی!

بدنصیب دہلی!

آہ دہلی ہزاروں سال سے اپنے فاتحوں کے ہاتھوں اجڑتی آئی تھی ——— پر اس مرتبہ خود اپنے سپوتوں کے، خود دہلی والوں کے ہاتھوں تباہ ہو رہی تھی ——— خود اس کے پرستار، باہر کے فسادیوں کے ساتھ مل کر خود اپنے بھائیوں کا گلا کاٹ رہے تھے۔

دہلی کی رواداری، دہلی کی یک جہتی، دہلی کی تہذیب، دہلی کی خوبصورت عمارتیں، دہلی کے قابلِ قدر ادارے …… تباہ ہو رہے تھے۔

دہلی میں غدر پڑا ہوا تھا۔ اور دہلی والے ——— مر رہے تھے، لُٹ رہے تھے، بھاگ رہے تھے، اور جو اس تباہی سے بچے ہوئے تھے وہ انسانوں کی اس

درندگی پر، اپنے پیارے وطن، اور اہل وطن کی تباہی پر خون کے آنسو رو رہے تھے!

اور اس نے جب دہلی کے فساد کی ——— اپنی پیاری دلی کی تباہی کی خبر سنی تو اس کا دل تڑپ اٹھا، اپنے احباب اور عزیزوں کے لٹنے اور شدید خطرے میں ہونے کی خبروں نے اس کی جان پر بنا دی! کئی ہفتے کس پریشانی، کس کرب کی حالت میں گزرے ——— یہ کچھ بس وہی جانتی تھی ——— پیارے عزیزوں، عزیز دوستوں کی کچھ خبر نہ تھی، وہ علمی اور ادبی ادارے جن سے اس کا گہرا دلی تعلق تھا کچھ معلوم نہ تھا کہ باقی ہیں یا وحشیوں کے ہاتھوں برباد ہو چکے ——— اُف کرب و اضطراب کا یہ سخت ترین زمانہ!! کا ہے کو کبھی کسی نے ایسا سخت وقت دیکھا ہوگا؟ اُس کا اپنا وطن، خاندان، اس کا گھر بار، اس کے دوست اس کی قوم، اس کا ملک سب مصیبت و تباہی کے بھنور میں پھنسے ہوئے تھے ——— ذلت و نامرادی کی بھیانک اور خوفناک مصیبتیں منہ پھاڑے سب کچھ نگلنے کو تیار تھیں۔

——— آہ! ——— کیا ہوگا؟ کیا ہوگا؟ دن اور رات، سوتے جاگتے ——— بس یہ ایک سوال اس کے دماغ میں گونجا کرتا...... لیکن کوئی جواب نہ ملتا تھا! انتظار ——— انتظار ——— بے بسی ——— کیسی سخت بے بسی ——— نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ نہ مصیبت زدوں کے پاس جا کر، ان کی مصیبت میں شرکت کر کے، ان کی کچھ خدمت کر کے اپنے بے قرار اور مضطرب دل کو تسکین دینے کی کوئی صورت، نہ اپنے دل و دماغ کو اتنا بے حس اور سخت بنانے پر قدرت کہ وہ یہ سب کچھ دیکھے اور سنے اور اثر نہ لے۔ اس کا حساس دل تڑپتا اس کا دماغ تخیل کی آنکھوں سے اُسے وہ سارے بھیانک اور وحشیانہ نظارے دکھاتا رہتا جو اس ملک میں ہو رہے تھے ——— اس کی رات کی نیند، دن کا چین سب ختم ہو چکا تھا۔ اس کے اعصاب پر، دل پر، صحت پر، دماغ پر شدید کرب اور بے چینی کی

کیفیت گزر رہی تھی ....

اور آخر کئی ہفتے میں اُسے صحیح حالات کا علم ہوا .... اس کے دوست اور عزیز کچھ پاکستان بھاگ گئے، بہت سے دہلی میں لٹ گئے اور اپنے ہندو سکھ پڑوسیوں کے باعث جان بچا سکے ...... بعض مارے گئے بے دردی اور ظلم کے ساتھ .... جو باقی تھے وہ بھی سخت پریشانی اور تکلیف میں دن گذار رہے تھے ......

اور جب اس کو قریب ترین دوستوں اور عزیزوں کی جان کی سلامتی کی اطلاع مل چکی تو اُسے دوسری فکروں نے ستانا شروع کیا .... جانے دہلی کے اردو کے ادبی اداروں پر کیا گزری؟ ان کا مرکز تو عین اسی جگہ ہے جہاں سب سے زیادہ جھگڑا، فساد، خوں ریزی و آتش زنی ہوئی ہے؟ کتنے دن اس پریشانی میں گزر گئے —— کوئی اطلاع اسے نہ مل سکی —— جانے کیا ہوا ہو؟ انھیں لوٹ نہ لیا گیا ہو؟ آگ نہ لگا دی ہو۔ مگر اس کا دل ہرگز ہرگز اس بات کو نہیں قبول کرتا تھا —— بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ قابل قدر ادبی ادارے جن کے بنانے میں کتنے آدمیوں نے اپنی پوری پوری عمریں گنوائی ہیں، یہ ادبی سرمایہ جس پر کوئی بھی قوم فخر کر سکتی ہے، ادبی دولت —— جس پر قوموں کی تہذیب و تمدن کی بنیاد ہوتی ہے —— کیسے کوئی تباہ کر سکتا ہے؟ نہیں نہیں ...... یہ ناممکن ہے ...... کیا ہندوستانی اتنے بے حس، اتنے بے درد ہو جائیں گے کہ ادبی اور علمی دولت کو بھی تباہ کرنے پر تل جائیں؟ یہ بربریت نہیں کر سکتے —— وہ بچ جائیں گے —— کسی معجزے کے زیرِ اثر بچ جائیں گے۔ لاکھ خطرہ ہو ٹل جائے گا ...... ضرور —— انشاء اللہ ......

اور اس قسم کی طفل تسلیوں سے وہ اپنے آپ کو تسکین دیتی رہی!

اور آج.......

یہ تار آیا......

اور امید کا آخری تار ٹوٹ گیا۔

ہندوستان کا وہ سب سے بڑا اور قابل قدر اردو ادب کا مرکز، جس کی ادبی اور علمی کتابوں کی شہرت سارے ملک میں پھیلی تھی، جس کی قدر و قیمت مسلّم تھی، جس کو بنانے میں ملک کے بہترین دل و دماغ چوتھائی صدی سے ان تھک محنت اور کوشش میں مصروف تھے ـــــ مجنونوں، وحشیوں نام نہاد انسانوں کے ہاتھوں انتقام کی آگ میں جل گیا۔

لاکھوں کا مال نقصان ہوگیا!

کروڑوں کا ادبی اور علمی سرمایہ تباہ ہوگیا۔

سالہا سال کی محنتیں، ان تھک کوششیں، خاک میں مل گئیں.......

کتنے اوراق جل کر راکھ ہوگئے۔

اُف.......

کوئی قیاس بھی کر سکتا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے؟

کیا ہوگیا ہے اُس کے اہل وطن کو؟

کیسے یہ وحشی انسان بنیں گے؟

اور اسی کے ساتھ اس کی عمر بھر کی محنت پر بھی پانی پھر گیا۔

مستقبل کے سارے سہانے خواب تاراج ہو گئے۔
زندگی کی ساری شیریں آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔
مسرتوں، خواہشوں، امنگوں، حوصلوں پہ اوس پڑ گئی۔
اس کے دماغ کی پیداوار ......
اس کے دل کے ٹکڑے ......
اس کے لخت جگر ......
اس کے معنوی بچے!
نہیں نہیں ـــــ اس کے حقیقی بچے ـــــ
آگ میں جل گئے ـــــ جل کر راکھ ہو گئے
اوہ خدایا!
اُسے یہ دن بھی دیکھنا تھا ـــــ
وہ کیوں اس دن کے لئے زندہ رہی؟
آہ .... وہ کیوں مر نہ گئی کہ یہ روح فرسا خبر نہ سنتی!
اب وہ کبھی کچھ نہ لکھے گی .... کیا اس لئے لکھے کہ اس کی عمر بھر کی دولت چند وحشی لوگوں کی آتش انتقام کی نذر ہو جائے؟

وہ اب اپنے اس شوق کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دے گی ...... اس مقصد کو جس میں اس کی جان بستی ہے، جس محور کے گرد اس کی زندگی گھومتی ہے، اس امنگ کو جس کے سہارے وہ سارے رنج و فکر، پریشانی و مشکلات ہنسی خوشی برداشت کرتی آئی ہے، اس مسرت کو جس کے بغیر اس کی روح کو سکون نہیں مل سکتا ......

ہمیشہ کے لئے ترک کر دے گی ......

آہ — اب اس کی باقی زندگی — بے مقصد — بے کار — سنسان — بے کیف — بے رنگ گزرے گی ......

ویران صحرا کی سی بھیانک زندگی !!

جانے وہ کب تک ...... کے دن اور رات — روتی رہی ......

گھلتی رہی ...... مایوسی اور نامرادی سے مغلوب ہوکر، درد و غم سے پسپا ہوکر ......

— اُسی کا نہیں اردو ادب کا مستقبل اس وقت اُس کے ملک میں تاریک نظر آرہا ہے، اردو زبان کا یہ سینکڑوں برس کا سینچا ہوا ہرا بھرا پودا سوکھا جارہا ہے اور کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ اِسے پھر کس طرح سرسبز کیا جائے ...... ہر طرف تاریکی ...... ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے، اور اس بھیانک اندھیرے میں اُسے کسی طرف راستہ نظر نہیں آتا ...... وہ شمع کی طرح گھل رہی ہے، مگر روشنی کی شعاع اُس کی رہبری نہیں کرتی ......

رونے کے سوا کوئی اور شغل اب اُس کا باقی نہیں رہا ؟

اور روتے روتے اس کے خیالات اپنی ذات سے ہٹ کر دوسری طرف منتقل ہوئے ......

یہ کیا ؟

تو اتنی خود غرض ہے ؟

اپنے معمولی سے نقصان کی، ایسے نقصان کی جس کا زمانہ تلافی کر سکتا ہے اتنا رنج کرتی ہے، اتنی مایوس اور غمگین ہے؟ یہ نہیں سوچتی کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے لوگوں پہ کیا بیت رہی ہے؟ اسی پر تو اپنے کو اتنا حساس اور درمند سمجھتی تھی؟ ---

ذرا سوچ —— غور کر —— دیکھ —— ملک کس دور سے گزر رہا ہے —— قوم کس تباہی و بربادی میں مبتلا ہے؟ تیرا مالی سرمایہ تباہ ہو گیا؟ پھر مہیا ہو سکتا ہے تیری کتابیں جل گئیں؟ پھر چھپ سکتی ہیں؟ غیر مطبوعہ کتابیں تلف ہو گئیں؟ کیا پھر نہیں لکھی جا سکتیں؟ لکھی ہوئی کتابیں جلا ڈالی گئیں، لیکن تیرے دماغ میں جو محفوظ ہیں انھیں کون تلف کر سکتا ہے؟

لیکن!

ذرا غور کر........

ان لوگوں کا خیال کر جو اس زمانہ میں اس طرح برباد ہوئے ہیں کہ پھر نہیں پنپ سکتے........ لاکھوں بے گناہ اور معصوم جانیں موت کے گھاٹ اتار دی گئیں، لاکھوں گھر تباہ ہو گئے اور گھر والے خانماں برباد غریب الوطن ہو گئے۔ کتنے منعم گدا، کتنے غیرت دار محتاج ہو گئے۔ کتنے بے ماں باپ کے بچے دربدر ٹھوکریں کھا رہے ہیں، کتنی عورتوں کے سہاگ اجڑ گئے، کتنی بہنیں بھائیوں سے بچھڑ گئیں، کتنے ماں باپ بچوں کے غم میں پاگل ہو رہے ہیں۔ کتنی عورتیں اپنی انمول اور عزیز ترین دولت، اپنی آبرو، کو گنوا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خون کے آنسو رونے کے لئے مجبور ہیں ——

درد و الم کا طوفان، تباہی و بربادی کا گرداب لوگوں کو گھیرے ہے اور نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا —— آسمان دور، زمین سخت، اپنے بیگانے، پرائے دشمن،

بڑے بڑے روح فرسا صدمات اٹھائے اور چھوٹی چھوٹی (لیکن سوچو تو حقیقت میں کتنی بڑی بڑی مصیبتیں) بھوک، سردی، بیماری، محتاجگی، بے وطنی کی مصیبت میں پھنسے لاکھوں آدمی تڑپ رہے ہیں، ایڑیاں رگڑ رہے ہیں ......

اور تو ——— تو ——— ؟

اپنے ان نقصانات پر رو رہی ہے جو ان مصیبتوں کے سامنے کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتے؟ جو اس طوفانِ بلا کے مقابلے میں ایک قطرے کے برابر بھی نہیں، مصیبتوں کے پہاڑ کے سامنے ذرہ کی سی حقیقت نہیں رکھتے ...... اور پھر بھی تو جی چھوڑ رہی ہے؟ کبھی نہ لکھنے والا عہد کر رہی ہے ...... غم و غصے سے کانپ رہی ہے ....

..... رو رہی ہے ——— ؟

رو ——— بے شک رو ——— اس انسانیت پر جو ختم ہو رہی ہے، اس تہذیب پر جو مٹ رہی ہے، اُس تمدن پر جو خاک میں ملا جا رہا ہے، ان نام نہاد مسلمانوں پر جو اپنی شرمناک حرکتوں سے اسلام کا نام بدنام کر رہے ہیں اور اپنے ہی بہن بھائیوں کے لئے اپنی وحشیانہ اور ذلیل حرکتوں سے اور زیادہ مصیبت اور تباہی کا باعث بن رہے ہیں، جو اسلام کی تعلیم سے بے خبر، مسلمان کی صفات سے بے گانہ انسانیت سوز حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں ——— رو ان ہم وطن درندوں پر جو آدمیت سے خارج ہو چکے ہیں۔ رو ان اخلاقی اقدار پر جو ظلم و فساد، تعصب و نفرت کی آگ میں جل کر بھسم ہو رہی ہیں۔

ہاں ماتم کر اس بے بسی اور بے ہمتی پر جو تجھے اور تجھ جیسے انسان کو کچھ کرنے نہیں دیتی، رو اُس بے حسی، بے عملی اور بے دردی پر جو لوگوں کو مصیبت زدوں

کا دُکھ درد نہیں سمجھنے دیتی ـــــــ اُس جہالت اور غلامی پہ جس نے ہندوستانیوں کو انسانوں سے درندہ بنا دیا شیطان بنا دیا.......

رُو ـــــ اتنا رُو کہ تیرا دل خون ہو کر بہ جائے ـــــ جسم آنسو بن کر پگھل جائے۔ رُو ـــــ رُو ـــــ اس لئے رو کہ تجھ جیسے بے عمل اور بے ہمت انسان رونے کے سوا اور کر ہی کیا سکتے ہیں؟

زندہ قوموں کے مستقل مزاج، باہمت اور حوصلہ مند انسان، محنت کرنے والا، باعمل شخص، خدا پر اور انسانوں پر اعتماد رکھنے والا ـــــ مایوس اور نا امید نہیں ہوتا ـــــ وہ ہاتھ پاؤں چھوڑ کر نہیں بیٹھا کرتا ـــــ وہ جدّوجہد کرتا ہے، کوشش کرتا ہے ـــــ زمانہ سے ٹکر لیتا ہے ـــــ زمانے کے خلاف جہاد کرتا ہے، اس کے عمل کا دائرہ کتنا ہی چھوٹا، اُس کا کام کیسا ہی بے حقیقت اور بے بضاعت ہو، اس کی کوشش کتنی ہی حقیر ہو، وہ محنت، دیانت داری اور مستعدی سے اپنا فرض ادا کرتا رہتا ہے، اپنے مقدور بھر حالات کو سنوارنے، مصیبتوں کو دور کرنے، ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ کہ کوشش کرنا انسان کا فرض ہے، اس کو کامیاب بنانا، اس کا مشکور کرنا ـــــ خدا کا کام ہے لیکن اُس جیسا بے ہمت انسان بس رُو سکتا ہے ـــــ

اور واقعی اپنی حالت پر اس کو شدت سے رونا آگیا ـــــ اس کی آنکھوں سے سیلاب اشک جاری تھا...... اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ سچ مچ اس کا دل خون ہو کر آنکھوں کی راہ بہ جائے گا۔

لیکن اگلے دن جب وہ بستر سے اٹھی تو اس کا دل ہمت اور حوصلہ سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے ایک عزم مصمم کا، آنکھوں سے ایک نئے استقلال کا اظہار ہو رہا تھا۔

وہ مغلوب نہ ہوگی .... مقابلہ کرے گی، اس سیلابِ غم کا، اس طوفانِ بلا کا، اس پر آشوب زمانہ کا۔ اور وہ ..... وہ اپنا کام جاری رکھے گی۔
اب تک اگر اُس کے شوق اور مقصد میں ذاتی اغراض، شہرت و عزت کی خواہش دولت و ثروت کی امید، خود غرضی کی لگاوٹ تھی تو اب وہ ان گھٹیا خواہشات کو چھوڑ کر، ایک بلند تر مقصد اپنے پیش نظر رکھے گی ——— وہ اپنے نفس کو فتح کرے گی ——— وہ بے غرض ——— پرخلوص ادبی خدمت کرے گی وہ خدمت جو انسانیت کی سچی خدمت کر سکے
اس نئے عزم نے اس کا چہرہ روشن کر دیا، آنکھوں میں ایک نئی چمک پیدا ہو گئی ——— مایوسی اور ناکامی کے بادل چھٹ گئے ——— ——— امید کا سورج جھانکنے لگا۔

بھائی

وہ دیکھو میری ماں بیٹھی سی رہی ہے، دیکھو اس کا چہرہ کتنا خوبصورت، اس کی آنکھیں کیسی پُر محبت ہیں...... وہ کیسی پیار بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی ہے...... میں دوڑتا ہوا آکر پیچھے سے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیتا ہوں...... وہ کھینچ کر مجھے سامنے کر لیتی ہے اور میرے منہ کو چومنے لگتی ہے۔" میرا لال ۔ ـــــ میرا بچہ ـــــ میرا چندا ـــــ میری امید ـــــ میرا سہارا ـــــ اپنی ماں کی تاریک زندگی کی روشنی......"

وہ دیکھو...... گھر کے ایک کونے میں...... بہت سے پتھر، لکڑی کے ٹکڑے، ٹوٹی شیشیاں اور شیشے کی گولیاں جمع کئے ہوئے میں اپنی بہن کے ساتھ بیٹھا کھیل رہا ہوں۔ اس کے سیاہ بال اس کے سرخ سرخ گالوں پر بکھرے ہوئے ہیں...... چھوٹے چھوٹے گورے گورے ہاتھ مٹی میں لت پت ہیں...... ہم اپنے اس سرمائے سے ایک عالیشان گھر بنانا چاہتے ہیں۔ مگر جونہی میں سمجھتا ہوں کہ اب گھر بن کر تیار ہوا...... وہ گر پڑتا ہے...... میں کچھ جھینپ کر کچھ خفا ہو کر بہن کی طرف دیکھتا ہوں...... جس کی چمک دار آنکھوں اور گلابی لبوں پر ہنسی ناچتی دیکھ کر مجھے غصہ آجاتا ہے...... مگر جیسے ہی وہ میرا ہاتھ پکڑ کر پیار بھرے لہجے میں کہتی ہے" خفا نہ ہو بھیا...... اور میں

جائے گا...... لاؤ اب کے پھر بنائیں گھر" تو میرا سارا غصہ بھاگ جاتا ہے۔ ہم دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑتے ہیں...... اور...... پھر گھر بنانے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

میں باہر سے کھیلتا ہوا آتا ہوں ــــ ماں کے پاس جانے کے لئے سامنے کوٹھری کی طرف بڑھتا ہوں...... اور ایک دم ٹھٹک کر اور سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ جاتا ہوں۔ میرا باپ نشے میں دھت...... میری بے زبان ــــ مظلوم ماں کو مار رہا ہے...... آہ...... کس بری طرح...... میری ماں اپنے دانتوں کو زور سے بھینچے، اپنے ہونٹوں کو مضبوطی سے بند کئے دونوں ہاتھوں سے وار بچانے کی کوشش کر رہی ہے...... اس کی پلکیں بوجھل ہیں۔ مگر ان سے آنسو نہیں گر رہے...... اس خونخوار ظالم نشے میں دھت اوباش مرد کے مقابلے میں...... وہ مند دار مظلوم مگر باہمت ہستی کتنی معصوم، کیسی پاکیزہ نظر آ رہی ہے...... ایسا لگتا ہے جیسے کسی مصور نے انسانیت اور درندگی کی تصویر بنائی ہے...... جیسے کسی ماہر نے شرافت اور بدکاری کا بہترین مرقع کھینچ دیا ہے...... اور جب وہ ظالم باہر چلا جاتا ہے تو...... ایک کونے میں چھپی ہوئی میری بہن روتی ہوئی آ کر...... ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے......

میں ڈرتا...... جھجکتا...... آگے بڑھتا ہوں...... ماں کے بکھرے بال، سوجا چہرہ زخمی ہونٹ دیکھ کر میرا دل غم و غصے سے اندر ہی اندر پھڑ پھڑانے لگتا ہے۔ ــــ میں جا کر ماں کے پاس چپ چاپ کھڑا ہو جاتا ہوں، ــــ وہ اپنی غمگین نظروں سے میری طرف دیکھتی ہے ــــ میں بے قابو ہو کر اس کی گود میں منھ چھپا کر رونے لگتا ہوں۔ ماں ہم دونوں کو گلے لگائے ــــ میرے منھ پر منھ سے ملنے لگتی ہے ــــ اور اس کے آنسوؤں کی رکی ہوئی باڑھ بہہ جاتی ہے"۔

زخمی نوجوان کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلی ہو گئیں۔

"اوہ وہ رہا میرا باپ .... اس نے مجھے گلی میں ضرور لڑکوں کے ساتھ کھیلتا ہوا دیکھ لیا ...... وہ سمجھ رہا تھا کہ میں اسکول میں پڑھ رہا ہوں ...... اب مجھے یہاں دیکھ کر ...... جانے کیا ظلم ڈھائے گا .... کہاں جاؤں ؟ کہاں چھپوں ؟ .... میں بھاگ کر پتلی سی گلی میں ایک مکان کی ڈیوڑھی میں چھپ جاتا ہوں اور کئی گھنٹے تک وہاں دبکا رہتا ہوں .... اس خوف سے کہ باہر نکلا اور باپ نے ہڈی پسلی ایک کی ...... کتنی رات گئے .... یہ سمجھ کر کہ اب وہ حسب عادت گھر سے باہر ضرور گیا ہوگا .... ڈرتے ڈرتے گھر میں دبے پاؤں داخل ہوتا ہوں ...... میرے پاؤں کی چاپ سن کر میری بہن کہیں سے آکر اندھیرے میں میرا ہاتھ پکڑ لیتی ہے اور میرے کان سے منھ لگا کر لرزتی آواز میں کہتی ہے ...... بھیا ..... وہ ...... اندر بیٹھے ہیں .... یہ موٹی لکڑی لئے .... اندر مت جانا بھائی انھوں نے آج پھر اماں کو بہت مارا ہے ...... آؤ باورچی خانہ میں تمھیں چھپا دوں ...... انھیں پتہ بھی نہ ہوگا کہ تم آگئے" اور بہن مجھے باورچی خانہ میں ایک دری پر لٹا کر اوپر سے اپنی رضائی لا کر اڑھا دیتی ہے ...... اور میں تھوڑی دیر میں سو جاتا ہوں ...... اور صبح اٹھتا ہوں تو باپ باہر جا چکا ہے ...... اور ماں محبت اور دکھ بھری نظروں سے میرے چہرے کو تک رہی ہے۔

میں اسکول سے بستہ لئے ...... خوشی خوشی گھر میں داخل ہوتا ہوں ...... آج اسکول میں مجھے شاباشی ملی ہے —— مگر جونہی گھر میں قدم رکھتا ہوں سامنے باپ کی غضب ناک شکل نظر پڑتی ہے، وہ مجھے دیکھتے ہی جھپٹتا ہے اور ایک دم مجھ پر تھپیڑوں اور مکوں کی بوچھار کر دیتا ہے —— بدمعاش —— پاجی —— آوارہ ——

اسکول سے روز بھاگتا ہے ـــــ پڑھنے سے تیرا دم نکلتا ہے ـــــ آوارہ لونڈوں کے ساتھ کھیلتا رہتا ہے ـــــ میں تجھے جیتا نہ چھوڑوں گا ـــــ یہ سب اسی عورت کی حرکتیں ہیں ـــــ میرے لڑکے کو لاڈ میں ستیاناس کر دیا ہے، ـــــ

وہ مجھے مار رہا ہے اور بک رہا ہے...... کتابیں میرے ہاتھ سے گر پڑتی ہیں اور ساتھ ہی ایک زور کی لات سے میں خود بھی گر پڑتا ہوں...... کہیں سے میری بہن دوڑتی ہوئی آتی ہے اور میرے اوپر گر کر باپ کے وار بچانے لگتی ہے...... باپ نے اُسے آج تک نہیں مارا...... وہ اسے بہت چاہتا ہے...... مگر اس وقت غصہ سے بدحواس وہ اس کو کھینچتا ہے...... وہ باپ کے دونوں ہاتھ پکڑ لیتی ہے اور مجھ سے کہتی ہے بھاگ جاؤ بھیا...... بھاگ جاؤ...... اور میں اٹھ کر بھاگتا ہوں ...... اور بھاگتے بھاگتے...... اضطراری طور سے پلٹ کر دیکھتا ہوں تو باپ بہن کے زور زور طمانچے مار رہا ہے...... میرا جی چاہتا ہے کہ پلٹ کر اس پر حملہ کر دوں ...... مگر خوف غالب آتا ہے اور میں باہر بھاگ جاتا ہوں......"

زخمی نوجوان نے اپنا چہرہ پھیرا تو اس پر درد و کرب جھلک رہا تھا

"ہاں یہ تھا میرا بچپن...... ایک طرف شریف...... مظلوم عاشقِ زار ماں تھی...... محبت کرنے والی...... بھولی بھالی پیاری بہن تھی...... دوسری طرف ظالم، سخت دل بدکار باپ تھا...... ایک طرف اچھی باتیں سکھانے کی کوشش تھی...... صبر اور ضبط کی تعلیم تھی...... محبت کی افراط تھی...... دوسری طرف ڈانٹ ڈپٹ، مارپیٹ، گالی گلوج تھی...... مجھے باپ کی صورت کے ساتھ ساتھ لکھنے پڑھنے سے بھی نفرت ہو گئی...... جو وہ چاہتا میں ہمیشہ اس سے اُلٹا کرتا

...... اس کی سختیاں بڑھیں اور میری گستاخی، بے خوفی اور نافرمانی بڑھتی گئیں...
اور آخرکار وہ بھی مجھ سے عاجز آکر ہار کر بیٹھ گیا۔ مگر ماں...... آہ..... میری پیاری
ماں...... اس نے کبھی مجھے میری باتوں پر برا بھلا نہ کہا...... کبھی بعض طعن نہ کی......
اسے کتنا بھی دکھ ہوتا ہے کبھی اس کا مجھ پر اظہار نہ کیا...... جب کبھی چوتھے آٹھویں میں
گھر پہنچ جاتا وہ اپنی غمگین آنکھوں سے جن میں محبت کے دریا لہریں مارا کرتے، مجھے دیکھتی...
مجھے پاس بلا کر بٹھاتی...... اور شیریں اور نرم لہجے میں مجھے نصیحتیں کرتی... میری بہن
پیار بھری نظروں سے میری طرف ایک سال تکتی اور نظروں نظروں میں نہ جانے کیا کچھ کہہ
دیا کرتی...... میں اس وقت دل میں عہد کرتا کہ جو ماں کہتی ہے کروں گا..... باپ
جیسا ہرگز نہ بنوں گا...... ماں کا دل کبھی نہ دکھاؤں گا...... ساری باتیں چھوڑ کر
پڑھنے لکھنے میں دل لگاؤں گا۔ شریف نیک جوان بن کر رہوں گا..... مگر آہ......
اپنا یہ عہدنامہ زیادہ دن نہ یاد رکھ سکتا...... باپ کی سختی اور ظلم مجھے سب کچھ بھلا دیتا...
.... نفرت، اور انتقام اور غصے کا جذبہ دل پر ایسا مسلط ہوتا کہ اور سب کچھ بھول جاتا....
میں اس کی ضد میں اور زیادہ خراب ہوتا گیا۔ باپ اور زیادہ خونخوار بنتا گیا..... ماں اور
زیادہ کمزور اور مظلوم ہوتی گئی...... اور آہ...... میری پیاری بہن..... جو سب سے
محبت کرتی..... سب کی حالت پر رویا کرتی...... باپ کی حرکتوں پر، ماں کی مصیبت پر،
بھائی کی عادتوں پر...... اور ان سب کے نتائج پر...... کتنی تاریک اور دکھ بھری تھی
اس کی زندگی !!

اور اسی طرح سال پر سال گزرتے گئے...... میری بہن جوان ہو گئی تھی اور ماں
بہت ضعیف اور کمزور...... ماں نے بہن کا بیاہ کر دیا...... ہائے..... کتنی روئی تھی

وہ رخصت کے وقت میرے گلے میں باہیں ڈال کر ...... بہن کے بیاہ کے کچھ عرصے بعد میری ماں مر گئی ...... دنیا کے دکھوں سے چھوٹ گئی ...... اور تھوڑے دن بعد باپ بھی ...... اب میں آزاد تھا ...... ماں کی محبت کا دباؤ، اور اس کے غم کا ڈر نہ تھا ...... باپ کی سختیوں اور ظلموں کا خوف نہ تھا ...... میں نے باپ کی رہی سہی پونجی خرچ کر ڈالی۔ گھر کا سامان اور آخر میں گھر بھی بیچ دیا ...... اور سال بھر تک خوب عیش کئے ...... اچھی سے اچھی شرابیں پیں، جوئے میں روپیہ اڑایا، اور ناچ گانے سے دل بہلایا ...... بہن نے مجھے کتنے خط لکھے ...... اپنے پاس بلایا، کہا مجھے آکر لے جاؤ۔ مگر میں نے کسی کا جواب نہ دیا ...... میں اپنی رنگ رلیوں میں مست تھا ...... مجھ میں سب عیب تھے پر ایک بات تھی جس پر یار دوستوں کے اصرار کے باوجود میں کبھی تیار نہ ہوا ...... مجھے بدکاری سے سخت نفرت تھی ...... کسی عورت پر بری نگاہ ڈالتے ہی میری آنکھوں میں اپنی ماں کا معصوم چہرہ پھر جاتا ...... مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی نے میرے دل پر زور سے گھونسہ مار دیا ہو"

زخمی بولتے بولتے تھک گیا ...... اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں ...... اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی ...... تصور میں وہ اپنی ماں کا شفیق اور حسین چہرہ اپنے پر جھکا ہوا دیکھ رہا تھا۔

"اور جب سال بھر بعد" وہ کچھ دیر بعد بولا۔ "میں سب کچھ کھو کر دانے دانے کو محتاج ہو گیا تو بہن خود آئی اور منت خوشامد کر کے مجھے اپنے گھر لے گئی۔ میرے بہنوئی نے مجھ سے ایسی محبت اور شفقت کا برتاؤ کیا جیسے کوئی بڑا بھائی کرتا ہے ...... بہن نے ایسی ایسی خاطر کی کہ ماں کو بھلا دیا ...... اوہ ...... کیسی پرسکون فضا تھی بہن کے گھر کی، کیسی پر مسرت زندگی تھی وہ بھی ...... محبت کرنے والے شریف میاں بیوی ......

دو ننھے ننھے پیارے پیارے بچے .... چھوٹا سا صاف ستھرا گھر ...... نہ جھگڑا
نہ لڑائی، نہ مار پیٹ، نہ گالی گلوچ .... اس گھر میں اور اس گھر میں کتنا فرق تھا ....
ایک نرک تھا دوسرا سورگ ..... ایک دوزخ تھا دوسرا بہشت ....

مگر آہ مجھے یہ بہشت بھی کھلنے لگا .... مجھے بڑی شرم آتی تھی کہ بہن بہنوئی کی روٹیاں ہٹا کٹا مرد ہو کر توڑتا رہوں .... بہن نے لاکھ منع کیا، بہنوئی نے بہت سمجھایا مگر میں نے نہ مانا اور نوکری کرنے کی ٹھان لی .... پڑھا لکھا نہ تھا، ہنر نہ سیکھا تھا، جگہ کہاں ملتی .... مگر آخرکار پولس کے محکمے میں میری کھپت ہو گئی ...... میرا چھ فٹا قد، گٹھا ہوا بدن، پر رعب چہرہ، میرا سب سے بڑا سفارشی ثابت ہوا ...... میں نے ایک رنگروٹ کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا اور دو برس میں بڑا کارگزار سپاہی سمجھا جانے لگا۔ عام لوگ مجھ سے ڈرتے ..... ساتھی مجھ سے دبتے ...... افسر میری قدر کرتے ..... مجھ میں "کارگزار" پولس والوں کی ساری صفات موجود تھیں۔

"اور پھر ...... پھر" سپاہی کی آنکھیں زیادہ سنجیدہ ہو گئیں۔ "پھر پچھلے سال اگست میں پنجاب میں فرقہ وارانہ جھگڑے شروع ہو گئے ..... لاہور میں .... امرتسر میں ..... جالندھر میں .... یہاں، وہاں، ...... جگہ جگہ میری بدلی ہوتی رہی ...... ہر جگہ میں نے زبردستوں کو مجبوروں پر ظلم ڈھاتے دیکھا ...... ہر جگہ غنڈے بدمعاش اور غرض والے لوگوں کو جاہل، ناسمجھ، جوشیلے لوگوں کو ابھار کر جھگڑا کراتے اور اس بہانے اپنا الو سیدھا کرتے پایا ..... میں سپاہی تھا ...... امن قائم کرنا میرا کام تھا ...... پر جب سب ہی اپنا فائدہ، اپنی غرض دیکھتے تھے تو میں بھلا کون سا فرشتہ تھا ...... ہم بھی ..... میں اور میرے ساتھی خوب لوٹ مار کرتے ..... طرف داری سے کام لیتے

اور عورتوں کے ساتھ زیادتی کرتے...... مگر اس آخری کام میں میں اپنے ساتھیوں سے ہمیشہ الگ رہا...... بلکہ جہاں تک ہو سکتا ایسی عورتوں کی مدد کرنے پر تیار رہا کرتا۔"

نوجوان سپاہی کے چہرے پر سکون کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آئی...

"اور پھر ہم نے سنا کہ ہندوستان آزاد ہونے والا ہے.... پھر سنا کہ ہندوستان بٹ گیا..... ہندوستان اور پاکستان.... اور پنجاب بھی تقسیم ہو گیا... مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب.... مسلمانوں کا پنجاب اور ہندوؤں سکھوں کا پنجاب!! اور لوگوں نے اِدھر سے اُدھر بھاگنا شروع کیا...... ایک جگہ کے لوگوں کے گھر چھڑا کر انھیں ستا کر دوسری جگہ بھیجا جانے لگا...... کہ اسے وطن بناؤ...... میری سمجھ میں تو بھائی کسی طرح یہ بات نہ آئی...... ملک بھی بھلا بانٹا جا سکتا ہے؟ وطن بھی بدلا جا سکتا ہے؟ میں تو جاہل اجڈ آدمی ہوں...... پر میری عقل قبول نہیں کرتی اسے! مجھ سے پوچھو تو میں کہوں گا کہ یہ بڑے بڑے لوگ، یہ لیڈر، یہ حاکم اور یہ ملک اور صوبے کو بانٹنے بٹوانے والے...... اصل میں وطن کی سچی محبت، گھر کی حقیقی چاہت، ملک کی اصلی بھلائی کو شاید جانتے ہی نہیں!"

اور برابر لیٹے ہوئے بڈھے زخمی کا چہرہ یہ سن کر آنسوؤں سے بھیگ گیا...

"ہائے انھیں بٹواروں نے، اسی بدلے اور انتقام نے، میرا بھی بھرا پرا گھر تباہ کر دیا سائیں! خاندان برباد ہو گیا...... گھر لٹ گیا...... وطن چھٹ گیا...... آبرو عزت خاک میں مل گئی اور آج...... میں محتاج...... غریب...... زخمی..... لاچار بے بس...... اس منحوس ہسپتال میں پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہوں......"

بڈھے کا گلا شدتِ گریہ سے رک گیا۔ نوجوان زخمی نے اسے تسکین دینی چاہی

مگر اسے الفاظ نہ مل سکے ـــــ شرم اور ندامت کا جذبہ اس کے دل پر غالب آگیا کچھ دیر دونوں اپنے اپنے خیال میں غرق چپ چاپ پڑے رہے۔

" میں ایک جگہ سے دوسری جگہ ڈیوٹی پر جاتا رہا ـــــ" نوجوان نے پھر سلسلۂ گفتگو شروع کیا۔ " ہر جگہ ظلم و ستم کا راج تھا، جو اس کے خلاف کرتا خود اس کے بھائی بند اس کے مخالف ہو جاتے۔ طرح طرح کے خوفناک تماشے، خونی ڈرامے دیکھتا بھالتا ـــــ ابھی مہینے بھر پہلے میں اس قصبے میں بدل کر آیا ـــــ تم جانتے ہو اس میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے ـــــ ہندوؤں کو خطرہ تھا کہ مسلمان انھیں ستائیں گے۔ چنانچہ انھوں نے انیو جیز کو اپنے گھروں میں لبانا شروع کر دیا۔ اس ضلع کے سارے مسلمان افسر، ساری مسلمان فوج، حاکم سب کے سب پاکستان چلے گئے تھے اور اب اس پُر امن شہر کے باشندے مخالفوں کے رحم و کرم پر تھے۔

یہاں کا نیا تھانیدار ـــــ چند مہینے پہلے مغربی پنجاب سے بدل کر یہاں آیا ہے اپنی برسوں کی پولس کی ملازمت میں بھی میں نے ایسا ظالم اور بے درد انسان نہیں دیکھا وہ پاکستان میں مسلمانوں کے ہاتھوں چرکے کھا چکا تھا ـــــ اس کے عزیز مارے گئے تھے، گھر لوٹ لیا گیا تھا، اس کا شہر اس سے چھٹ گیا تھا اور جوش غضب اور جذبۂ انتقام نے اسے پاگل بنا رکھا تھا ـــــ وہ سب کے سامنے کہتا تھا کہ مجھے مسلمانوں سے اپنا بدلہ لینا ہے ـــــ اور اس نے ایسا سخت بدلہ لیا کہ شاید ہی کسی نے لیا ہو ـــــ اُس نے آس پاس کے سارے مسلمانوں کے گاؤں لٹوائے، شہر کے لوگوں کو طرح طرح سے ستایا، ہر طرح کے ظلم ان پر ڈھائے ـــــ عورتوں کے ساتھ وہ کچھ کیا جس کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں ـــــ اُس کے افسر ساری

حرکتیں دیکھتے اور چپ رہتے ـــــ شاید خوش ہوں کہ یہ اس طرح ہم سب کا بدلہ لے رہا ہے۔ میں اس کا ہم مذہب تھا، ماتحت تھا، اس کے احکام بجا لاتا تھا۔ مگر پھر بھی بعض وقت یہ سب دیکھ دیکھ کر میرا عجیب سا حال ہونے لگتا تھا ـــــ یہ بات تو میری سمجھ میں آتی ہے کہ دنیا میں کچھ لوگ اچھے ہوتے ہیں، کچھ بُرے ہوتے ہیں ـــــ کچھ نیک کام کرتے ہیں کچھ برے کام کرتے ہیں، کچھ مظلوم ہوتے ہیں، کچھ ظالم ہوتے ہیں ـــــ لیکن اتنے بہت سے آدمیوں، قوم کی قوم کو اس طرح پاگل، وحشی بنتے دیکھ کر میرا دل بعض اوقات بے قرار ہو جاتا ـــــ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہوگا کیا اب سب لوگ ایسے ہی بن جائیں گے.....؟ بہت سے خیالات، بہت سے وسوسے بہت سے اندیشے میرے دل میں پیدا ہوتے مگر کوئی نہ تھا جس کے سامنے میں اپنا دل کھول کر رکھ سکتا ـــــ اور میں پھر اپنے کام میں لگ جاتا ـــــ کبھی بے حس ہو کر ـــــ کبھی مجبور ہو کر ـــــ

"میری بہن مغربی پنجاب میں تھی ـــــ ابھی کچھ دن پہلے مجھے....... آہ...... مجھ بدنصیب کو یہ خبر ملی کہ جس گاؤں میں وہ رہتی تھی وہاں بھی فساد ہوا۔ میری بہن کا گھر جلا دیا گیا ـــــ ہائے وہ دنیا کا سب سے پرسکون اور پرمسرت گھر میرے بہنوئی کو، میرے بھائی کی طرح شفیق بہنوئی کو مار ڈالا ـــــ میرے پھول سے بھانجے بھانجی کو ان کی ماں کی آنکھوں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، ـــــ اور ہائے میری بہن، میری باعصمت پاکباز بہن کو جانے کہاں پکڑ کر لے گئے، جانے وہ زندہ ہے یا مر گئی! کاش مر گئی ہو ـــــ بے آبروئی کی زندگی سے موت ہزار درجہ اچھی ہے بھائی۔"

اور سپاہی کے ساتھ ساتھ بڈھے زخمی کا چہرہ بھی غصہ سے سُرخ ہوگیا ...... دھندلی آنکھیں جوش سے چمکنے لگیں ...... "میری بات یاد رکھنا جوان، یہ قوم ...... یہ ملک ..... آج نہیں تو کل ـــــ ضرور ڈوبے گا ـــــ ضرور تباہ ہوگا ... جو لوگ اتنے وحشی، ایسے درندے بن جائیں کہ ان کے ہاتھوں باعصمت عورتوں کی عزت بھی محفوظ نہ رہے، وہ اپنے ملک و قوم کو ضرور تباہ و برباد کر کے چھوڑیں گے ......

جانتے ہو جوان میں کیوں زخمی ہوا؟ اس قصور پر، اس قصور پر کہ ایک ہندو لڑکی کی عصمت بچانے کے لئے میں نے اسے اپنے گھر میں چھپا لیا تھا۔ غنڈوں نے لاکھ ڈھونڈا مگر اسے نہ پا سکے ... پھر میں نے اسے اپنی بیٹی بنا کر محفوظ جگہ بھیج دیا۔ لیکن ان بدمعاشوں کو خبر لگ گئی، انھوں نے مجھے مارا ...... اور پھر ...... پھر ہندوؤں اور سکھوں نے میرا گھر لوٹ لیا، میری لڑکیاں پکڑلے گئے، اس بڈھے کی جس نے ان کی لڑکی بچانے کی خاطر اپنی جان کی پرواہ نہ کی" بڈھے کی آنکھوں سے جلتے جلتے آنسو بہہ رہے تھے۔

زخمی سپاہی کے منہ سے ایک سرد آہ نکلی ...... آہ کیا بتاؤں بڑے میاں میرا کیا حال ہوا۔ یہ ظلم و ستم! یہ بدکاریاں دیکھ کر جیسے نفرت اور غصہ پیدا ہوتا تھا۔ اب اپنی بہن اور اس کے خاندان کی تباہی کا حال سن کر نیم مجنوں سا ہوگیا ـــــ اب مجھے معلوم ہوتا کہ یہ سب ٹھیک ہو رہا ہے، آخر ہم پر بھی تو یہ لوگ اسی طرح ظلم ڈھا رہے ہیں ...... پھر ہم کیوں نہ لیں بدلہ ......"

ساتھی نے تیز نظروں سے سپاہی کی طرف دیکھا اور بات کاٹ کر بولا "یہ کیا بدلہ ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ بدلہ لیا جاتا ہے ظلم کرنے والوں سے، ستانے والوں سے ...... یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ظالموں، ناانصافوں سے تو ڈر کر بھاگ

جائیں، بزدلی اور نامردی کے ساتھ......... اور دوسری جگہ آکر بے قصور، مظلوم لوگوں پر ظلم ڈھائیں، یہ بدلہ نہیں...... انتقام نہیں...... ظلم ہے، سیاہ باطنی ہے .... دشمنی ہے ...."

سپاہی نے آہستہ سے جواب دیا "ٹھیک ہے، پر جوش میں، جنون میں یہ کب سوجھتا ہے، کب یاد رہتا ہے۔ شرم آتی ہے بتاتے ہوئے، پر سچ یہ ہے کہ اب میں یہاں کے حاکموں اور فسادیوں کے ساتھ لوٹ مار، ظلم و ستم میں برابر کا شریک بن گیا...... میں انتقام کی آگ میں سلگ رہا تھا........ بدکاری جس سے مجھے نفرت تھی، جس پر میں اپنے ساتھیوں سے لڑتا تھا، ان سے نفرت کرتا تھا....... اب ہر عورت کو دیکھ کر میرے دل میں یہ شعلہ بھڑک اٹھتا کہ اسی کے فرقے والوں نے میری بہن کو بے عزت کیا ہے...... جانے کیا کیا جذبات میرے دل میں پیدا ہوتے........ دوسروں کی ذلیل حرکتوں پر اب میں نفرت سے منہ نہ پھیرتا، بلکہ مجھے ایک قسم کی مسرت ہوتی ــــــ اچھا ہے میری بہن کا انتقام لیا جا رہا ہے........" اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانک لیا .... اس زخم سے خون رس رہا تھا، مگر وہ اس سے بے خبر کسی اور زخم کی ٹیس سے تڑپ رہا تھا........ ساتھی جو ہمدردی اور نفرت کے متضاد جذبات سے مغلوب تھا آہستہ سے بولا........ یہ تو بتاؤ کہ تم کیسے زخمی ہو گئے جوان؟......."

"کچھ دن ہوئے ہم نے قریب کا ایک گاؤں لوٹا تھا، وہاں کے بہت سے لوگ مر گئے، کچھ ادھر ادھر بھاگ گئے، کچھ اس قصبے میں چلے آئے، جہاں ان کے ہم مذہبوں نے انھیں پناہ دی...... مگر پولس کو یہ گوارا نہ ہوا...... انھوں نے شہر والوں کو دھمکا کر ان لوگوں کو ان کے گھر سے نکلوا دیا...... اس قصبے کے آس پاس کوئی بھی کیمپ رفیو

چیز کا نہیں ہے، نہ ہندوؤں کے لئے نہ مسلمانوں کے لئے ...... یونہی لوگ آتے ہیں اور پڑے رہتے ہیں ...... تھانے دار نے ایک خالی پڑے اسکول میں آس پاس کے لٹے کھسٹے لوگوں کو بھیڑ بکری کی طرح بھر دیا تھا ...... اور یہ جگہ اس کے ظلم و ستم اور بدکاری کا سب سے زیادہ نشانہ بن گئی تھی ...... یہاں ان لوگوں کے لئے کوئی کھانے پینے کا انتظام بھی نہ تھا ...... شہر والے جب موقع ملتا رحم کھا کر کھانا دے جاتے ...... ہم پانچ چھ سپاہی ان کی حفاظت کے نام سے یہاں رہتے تھے، اور در اصل گپ شپ اور بے ہودہ حرکات میں اپنے وقت کاٹتے تھے ...... میرے ساتھی اول نمبر کے بدمعاش تھے۔ اور پہلے کی آئی ہوئی جانے کن کن عورتوں پر ہاتھ صاف کر چکے تھے اور اب نئی آنے والیوں پر دانت لگائے بیٹھے تھے ...... یہ عورتیں ہم سے ایسی خائف تھیں جیسے زخمی ہرن خونخوار بھیڑیوں سے ...... وہ کونوں میں چھپتی پھرتیں رفع ضرورت کے لئے بھی دن دن بھر اور رات رات بھر باہر نہ آتیں ...... وہ شاید دوسری عورتوں کا انجام سن چکی تھیں۔

مجھے یہاں ڈیوٹی پر آئے دوسرا دن تھا ...... شام ہو چکی تھی اور رات کی سیاہی رفتہ رفتہ پھیلتی جا رہی تھی، کچھ سپاہی اسکول کے دوسری طرف بیٹھے تھے ...... ایک طرف میں اور میرا دوست بیٹھے بیڑی پی رہے تھے ...... میں چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اور میرا دماغ جانے کہاں کہاں بھٹک رہا تھا ...... کبھی بہن کا گھر، وہ پُر مسرت گہوارہ میری آنکھوں میں پھرنے لگتا، کبھی وہ پیارے پیارے بچے آ کر مجھ سے لپٹ جاتے، کبھی بہن کی معصوم صورت آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی اور کانوں میں اس کی دلدوز چیخیں گونجنے لگتیں ......

"بچاؤ ...... بچاؤ ......" ایک دم میں تھانے دار کی گرج سن کر چونک اٹھا ......

وہ دوسری طرف کسی شخص کو ڈانٹ رہا تھا...... میں جانے کو اٹھا مگر میرے دوست نے میرا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا ـــــ بیٹھو بھی یار، وہ بک جھک کر آپ ہی چلا جائے گا۔ ہم کیا کریں گے وہاں جاکر ـــــ پوچھے گا تو کچھ بہانہ بنا دیں گے..... میں پھر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی آواز آنی بند ہوگئی اور قدموں کی چاپ سے اندازہ ہوا کہ وہ چلا گیا۔

کچھ دیر بعد ہم نے دیکھا پیچھے کے دروازے سے دو تین عورتیں، دو مردوں کے ساتھ سر سے پاؤں تک چادریں لپیٹے، دبے پاؤں عمارت سے نکلیں اور آہستہ آہستہ ایک طرف جانے لگیں ـــــ میرے ساتھی کی نظر ان پر پڑ گئی، میرا ہاتھ کھینچتا ہوا بولا "چلو دیکھو کہاں جا رہے ہیں یہ لوگ"۔ میں نے کہا "جانے دو کسی ضرورت سے جاتے ہوں گے"۔

"آؤ بھی یار ـــــ آج شکار قبضے میں آیا چاہتا ہے ـــــ چھوڑو اس پارسائی کو ـــــ آؤ آج اپنی بہن کا بدلہ چکا دو ـــــ"

میں ایک مسحور آدمی کی طرح اس کے ساتھ ساتھ ہولیا۔ ہمیں دیکھ کر وہ لوگ سہم گئے۔

"کہاں جاتے ہو تم لوگ"۔

"کچھ نہیں جمعدار جی ـــــ ذرا ان عورتوں کو کچھ ـــــ کچھ...."

"کیا بکتا ہے بڈھے؟.... کچھ کچھ کیا؟ بھاگنا چاہتا ہے ان عورتوں کو لیکر"۔

"اجی ذرا یہ ٹٹی کو جا رہی ہیں"۔

"ہٹو تم لوگ، ہم خود ان کی حفاظت کے لئے ساتھ جائیں گے"۔

جوان مرد نے بگڑ کر کہا "کیا کہتے ہو جی؟ اپنی ماں بہن کو اکیلا تمھارے ساتھ کیسے بھیج دیں"۔

"کیا بکتا ہے بے ——— ہمیں خبر ہے تم کس لئے جا رہے ہو ——— نہیں جانے دیں گے، ہم سرکاری آدمی حفاظت کے لئے یہاں مقرر ہوئے ہیں ——— تم لوگ کہیں نہیں جا سکتے۔ ان عورتوں کو جانا ہے تو اکیلی جائیں، ہم دور کھڑے ان کی حفاظت کریں گے۔"

دو عورتیں چیخ کر مردوں سے لپٹ گئیں اور گھٹی گھٹی آواز میں بولیں

"بھیا...... چاچا ——— ہم نہیں جائیں گے ——— ہمیں کہیں نہیں جانا چلو اندر..... چلو......" اور وہ سب کے سب، مرد عورتوں کو گھسیٹتے عمارت کی طرف بھاگے تیسری لڑکی چیختی ہوئی ان کے پیچھے لپکی ——— "ارے..... ارے بھی ذرا تو ٹھیرو..... مجھے چھوڑو نہیں، مجھ سے نہیں بھاگا جاتا...... ہائے ٹھیرو میں بھی آ رہی ہوں......" وہ لڑکھڑاتی ہوئی ان کے پیچھے بھاگی۔ پر وہ چاروں رُکے نہیں...... بھاگتے ہوئے عمارت میں گھس گئے...... شاید اس لڑکی کے سرپرست سب ختم ہو چکے تھے...... میرے ساتھی نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا "اجی جانی کہاں ہو..... آؤ ہمارے ساتھ ہم لے چلیں گے جہاں جانا ہے۔"

اس نے اپنا سارا زور لگایا کہ کسی طرح اپنا ہاتھ اس سے چھڑا لے، مگر کہاں وہ وھان پان، فاقوں کی ماری، غموں کی ستائی لڑکی، اور کہاں یہ دیو ہیکل، ہٹا کٹا جوان...... جس پر نفس کا بھوت سوار تھا...... وہ بے بس ہو کر بیٹھی..... میں اس وقت خود پاگل سا ہو رہا تھا...... مجھ پر بھوت سوار تھا...... میں نے اس لڑکی کی طرف غور سے دیکھا کہ اس پر میرا قبضہ ہو جائے...... یہ ایک سترہ اٹھارہ برس کی نوعمر لڑکی تھی، بال بکھرے ہوئے چاند سے چہرے پر پڑے تھے...... سیاہ آنکھیں خوف سے پھیل کر ضرورت سے

زیادہ بڑی نظر آ رہی تھیں، جیسے کوئی وحشی ہرنی...... شکاریوں میں گھری ہوئی....... جائے پناہ ڈھونڈ رہی ہو۔

میری نظر اس پر جم کر رہ گئی...... کیسی حسین...... کیسی خوبصورت لڑکی ہے یہ؟ میں نے اپنے دوست کی طرف دیکھا "یار یہ میرا حصّہ ہے" ساتھی نے حیرت سے مجھے دیکھا اور پھر مسکرا کر بولا "اچھا پہلے تم ہی......" میں لڑکی کی طرف بڑھا...... لڑکی نے میری طرف نظر اٹھائی...... اس کی پاکباز نگاہ تیر کی طرح میرے دل میں جاکر گڑ گئی...... مجھے نہیں معلوم کیوں...... اس لیے کہ اس وقت مجھ میں اور دوسرے درندوں میں کوئی فرق نہ تھا، اس نے مجھے اوروں سے مختلف سمجھا، وہ لپک کر آگے بڑھی اور میرا دامن تھام کر لرزتی ہوئی آواز میں ایک کراہ کی طرح اس کے منہ سے نکلا "بھائی، تو مجھے بچا لے!"

آہ یہ کیا ہوا...... کسی نے میرے دل میں نشتر چبھو دیا...... بھائی...... بھائی...... بہن...... اپنی بہن کی بے کسی اور بے بسی میری آنکھوں میں پھر گئی...... اس نے بھی کسی وحشی سے اسی طرح پناہ مانگی ہوگی...... وہ بھی عورت تھی...... شریف...... باعزت...... یہ بھی عورت ہے، پاکباز...... معصوم...... مجھے خیال میں غرق دیکھ کر میرے ساتھی نے ڈپٹ کر مجھ سے کہا...... "ابھی سوچتے کیا ہو...... یہ رحم کھانے کا موقع نہیں ہے ___ تمھیں تامل ہے تو لاؤ میرا مال مجھے دے دو۔" میں نے چونک کر لڑکی کی طرف دیکھا ___ شیطان نے پھر مجھے بہکا دیا ___ میں نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے اپنی طرف کھینچا، دوست دوسری طرف چلا گیا ___ میں لڑکی کے چہرے پر جھکا...... اس نے ایک مرتبہ پھر اپنی خوبصورت آنکھیں میری

خونخوار آنکھوں میں ڈال دیں اور آہستہ آہستہ اس کے پتلے پتلے ہونٹ ہلے ....
"بھائی ......تیری بھی ماں بہن ہوں گی ...... ان کے صدقے میں مجھے جانے دے
چھوڑ دے۔"

"اُف، آہ ...... میرا سارا بدن کانپنے لگا ...... یہ لڑکی... یہ ....یہ تو
میری ماں ہے، ــــ ماں، بالکل وہی صورت ..... چہرے پر وہی معصومیت اور
پاکبازی ...... آنکھوں میں وہی درد وکرب کا طوفان اور بے بسی کا سمندر لہریں مارتا
ہوا ...... ہونٹوں پر وہی دلدوز مسکراہٹ ....

میرے کانوں میں اپنی ماں کی آواز زور زور سے گونجنے لگی۔ "میرے بچے
میری جان ــــ اگر تجھے اپنی ماں کا ذرا سا پاس ہے، .... اس کی ذرا سی
عزت تیرے دل میں ہے، .... تو ــــ تو .... کبھی کسی عورت کی آبرو پر ہاتھ نہ
ڈالیو، ...... ہر شریف، باعصمت عورت تیری ماں ہے .... تیری بہن ہے ......
اگر .... اگر تو نے اس کے خلاف کیا تو .... گویا

ماں کی آواز اونچی سے اونچی ہوتی جا رہی تھی اور ہتھوڑے کی کڑی ضربوں
کی طرح میرے دماغ پر پڑ رہی تھی ...... یہ میری ماں ہے ...... یہ میری ماں ہے
..... اور مجھ ..... مجھ نفس کے غلام ..... انسان نما شیطان .... آدمی نما درندے
نے ..... اِسے ..... اسے بری نظر سے دیکھا ؟؟

میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے زمین پر پڑی ہوئی لڑکی کا ہاتھ پکڑا ...
اس کا سارا جسم بید کی طرح لرز رہا تھا اور اس سخت سردی میں ٹھنڈے پسینے سے
اس کی پیشانی تر تھی ...... میں نے اسے اٹھایا اور دھیرے سے کہا "بہن .. ....

گھبرا نہیں ...... تو میری بہن ہے ...... میری حفاظت میں ہے .....'' اُف اسکی وہ نظریں .... وہ پیار بھری نظریں ..... جن میں احسان مندی کی ایک دنیا پوشیدہ تھی .... دنیا کی ساری دولت، ساری خواہشیں، ساری آرزوئیں اس ایک نظر پہ قربان ..... اف وہ معصوم محبت سے لبریز نظریں! اس کی ہرن جیسی آنکھوں سے شفاف موتیوں کا مینھ برسنے لگا ..... کس پیار سے اس نے میرا ہاتھ تھاما ......
" بھائی " ..... آہ کیسا شیریں تھا یہ لفظ!"

نوجوان زخمی کی آنکھوں سے آنسوؤں کا طوفان بہ نکلا ..... بڈھے زخمی کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے ...... اس نے پہلی مرتبہ عقیدت کی نظر سے زخمی نوجوان کو دیکھا۔

اور سپاہی کی آواز جو ابھی محبت کے جذبے کے اثر سے بڑی نرم پڑ رہی تھی شیریں ہو رہی تھی۔ یکلخت کرخت ہو گئی، چہرہ سُرخ ہو گیا، آنکھوں سے آگ نکلنے لگی .... جیسے ہی میں اپنی بہن کو عمارت کی طرف لے جانے لگا کہ اسے اس کے ساتھیوں کی حفاظت میں دے آؤں۔ کسی طرف سے دو سپاہی لپکتے ہوئے آئے اور مجھے آنکھ مار کر بولے " کہاں، کہاں ادھر لاؤ، ادھر" میں نے ڈپٹ کر کہا " بکو نہیں ..... ہٹ جاؤ سامنے سے" اور بہن کا ہاتھ کھینچتا ہوا آگے بڑھا .... وہ طنز سے بولے " اوہو ..... اپنی معشوقہ کو کسی کو ہاتھ نہ لگانے دیں گے" " اجی نیا نیا عشق جو ٹھیرا" میں غصّے سے چلایا " کیا بکتا ہے پاجی ..... خبردار جو ایک لفظ اور منھ سے نکالا ..... یہ میری بہن ہے ......" دوسرا بدمعاش کھل کھلا کر ہنس پڑا ..... " اجی جوان، آپ کی بہن کو سب انسپکٹر صاحب عزت بخشنے کے لئے بلا رہے ہیں" میں سارے بدن سے کانپ گیا .... تو وہ

بدمعاش، پاجی ابھی یہیں موجود ہے۔ اُف کیا کروں ...... ان سپاہیوں سے نہیں نپٹ سکتا ہوں ...... ڈرا دھمکا کر، سمجھا کر بات منوا سکتا ہوں۔ مگر اس سیاہ کار سے اس معصوم کو کیسے بچاؤں؟ ...... مجھے پریشان دیکھ کر وہ دونوں آگے بڑھے اور لڑکی کا دوسرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگے ...... میں غصّے سے بدحواس ہوگیا ...... دونوں کو زور زور سے ٹھوکریں جمائیں ...... "اگر اسے ہاتھ لگایا تو ابھی جہنم بھیج دوں گا"۔ وہ دونوں گر کر پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے گُتھ گئے ..... میں یوں بھی ان دونوں پر بھاری تھا۔ اور اس وقت تو نہ جانے مجھ میں کہاں کی طاقت آ گئی تھی کہ ذرا دیر میں میں نے ان کو ادھ موا کر کے گرا دیا ...... لیکن فوراً ہی سامنے سے اس "شیطان" کو آتے دیکھ کر میں پھر لرز اٹھا ...... اس نے کڑک کر کہا "کیا ہو رہا ہے یہ" سپاہیوں نے فریاد کی نظر سے اس کی طرف دیکھا "اس نے ہمیں مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ ہم تو صرف آپ کے حکم کے مطابق ...... اس لڑکی کو آپ کے پاس لا رہے تھے" تھانے دار خونیں نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ میرے منہ سے نکلا "سب انسپکٹر صاحب یہ لڑکی میری بہن ہے ...... میں اس کی عزت کی حفاظت کروں گا ..... کسی کی مجال نہیں کہ اسے چھو سکے ......" اس نے زہر بھرے لہجے میں کہا "معشوقہ کو بہن کہتے ہوئے شرم نہیں آتی؟" میں غضب ناک ہو کر چلایا "بدمعاش جیسا تو خود ہے ویسا ہی دوسروں کو سمجھتا ہوں ...... تو کیا جانے ماں بہن کی عزت کرنا کسے کہتے ہیں، اگر تیرے دل میں اپنی ماں کی عزت ہوتی تو ہر عورت کی عزت کرتا ......" ابھی میری بات پوری نہ ہوئی تھی کہ تین سپاہی مجھ سے لپٹ گئے اور بُری طرح مجھے مارنے لگے ...... مجھے کچھ ہوش نہ تھا کہ کہاں کہاں میرے چوٹ آ رہی ہے ...... میں پوری طاقت سے ان سے

نبٹ رہا تھا کہ میں نے دیکھا وہ شیطان لڑکی گھسیٹ رہا ہے۔ " اور ہائے ماں..... ہائے بھائی...... " بے بسی سے لڑکی کے منہ سے نکل رہا ہے۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ " پاجی ...... بے ایمان ...... شیطان ...... درندے ...... دیکھ اچھا نہ ہوگا ...... چھوڑ دے اس لڑکی کو ـــــ میری بہن ـــــ ظالم ـــــ اتنے ظلم و ستم کرنے کے بعد بھی تیرا دل ٹھنڈا نہ ہوا ـــــ چھوڑ دے اسے ورنہ ـــــ میں ـــــ میں تجھے تباہ کر دوں گا ـــــ برباد کر دوں گا ـــــ میں تیرے سارے کرتوت افسروں سے بیان کر دوں گا...... میں پرائم منسٹر سے کہوں گا، بڑے لاٹ سے جا کر کہوں گا۔" اور جانے کس طاقت کے زیر اثر، چشم زدن میں میں تینوں سپاہیوں کو گرا کر تھانے دار کی طرف جھپٹا...... اسے لات مار کر زمین پر گرا دیا..... لڑکی دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی...... میں نے اسے گود میں اٹھا لیا..... اور بے تحاشا بھاگا......

ایک دھماکے کی آواز آئی۔ کوئی چیز سرسراتی ہوئی میرے کان کے پاس سے نکل گئی...... اضطراری طور سے میں نے پلٹ کر دیکھا، تھانے دار پستول کا گھوڑا چڑھا رہا تھا..... اور...... گولی میرے بائیں شانے کے آر پار تھی...... ایک لمحے میں اپنی پوری طاقت جمع کئے کھڑا رہا اور چاہتا تھا کہ پھر بھاگوں...... مگر...... گر زمین پر گر گیا...... لڑکی مجھ پر جھکی " تم کیسے نیک، کتنے شریف ہو...... تم سچے جواں مرد ہو...... تم نے ایک بے بس بے کس کے لئے اپنی جان دے دی...... بھائی ...... آہ بھائی ...... میرے بھائی..... اب میرا کون ہے۔" اس کے قیمتی آنسو میرا خاک و خون بھرا منہ دھو رہے تھے...... میں نے انگلی آسمان کی طرف اٹھائی... " بہن...... وہ " اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا...... کل...... مجھے ہوش آیا...

تو یہاں پڑا تھا...... جانے میری بہن کا کیا ہوا؟ ہائے میری بہن...."

بڑے ساتھی نے کس محبت اور عقیدت سے نوجوان کی بہادری کو سراہا.....

..... پر اسے خبر نہ تھی...... وہ سامنے دیوار پر اپنی نظریں گاڑے تھا..... جہاں سے اس کی مرحومہ ماں، لاپتہ بہن اور ننھی بہن کے حسین اور معصوم چہرے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

ایک نوجوان سپاہی دروازے سے آتا دکھائی دیا اور زخمی پر آکر جھکا.....

" کیسے ہو بھائی " اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی..... زخمی سپاہی نے اپنی ختم ہوتی ہوئی طاقت کو جمع کر کے آہستہ سے کہا...... "بتاؤ دوست کیا ہوا میری بہن کا"

" مجھے افسوس ہے دوست کہ تمھاری قیمتی جان اس ضدی لڑکی کی بھینٹ ہو گئی !!

" مجھے فخر ہے...... خوشی ہے...... ناز ہے....." اس کا دوست چپ ہو گیا...... زخمی نوجوان ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا، اس کے زخم سے جیتا جیتا خون تیزی سے بہ رہا تھا۔

" بتا دو بھائی، میری بہن کا کیا ہوا؟" دوسرے نے اس کی طرف دیکھا اور اپنا سر جھکا لیا اور اسے سہارا دے کر لٹانے لگا..... زخمی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر بستر پر گر پڑا۔ سر ایک طرف ڈھلک گیا...... آنکھیں دھیرے دھیرے بند ہو گئیں۔ اس کے شکیل چہرے پر نور کی بارش ہو رہی تھی ——— بڑے زخمی اور نوجوان سپاہی نے انتہائی عقیدت اور احترام کے ساتھ اپنا سر اس سورما کے سامنے جھکا دیا!

پانی پت

ہزاروں برس سے میری کہانیاں دوسرے سناتے آئے ہیں۔ آج خود مجھ سے میرا قصہ سنیئے! آپ نے میرا نام تو ضرور سنا ہوگا۔ میں کوئی بہت بڑی دولت مند اور متمول بستی نہیں۔ لیکن پھر بھی اس دیس میں میری ایک خاص حیثیت رہی ہے۔ اور تاریخ کے صفحوں میں میرا نام محفوظ ہے، پانی پت! اور مختلف قسم کی یادیں اس نام کے ساتھ وابستہ ہیں۔

آپ دہلی سے شمال کی جانب انبالے کی طرف چلیں تو باون میل پر آپ کا سواگت کروں گا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سواگت کرتا۔ اب تو میں اس قدر بے دست و پا ہو گیا ہوں کہ نہ اپنوں کی حفاظت کر سکا اور نہ مہمانوں کا استقبال کر سکتا ہوں۔

میری کل آبادی ۵۴ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ اگر آپ کو صرف دولت و ثروت، صنعت و تجارت اور عیش و عشرت کی چہل پہل میں دلچسپی ہے تو ادھر آنے کی زحمت گوارا نہ کیجیے، اس کے لئے اور بہت سے شہر موجود ہیں۔ لیکن اگر آپ کو تہذیب و تمدن کے ایک بنتے اور بگڑتے مرقع کو دیکھنا ہے تو ضرور آیئے اور اس درد بھری داستان کو سن لیجئے جس میں آپ کو ہندوستان کے عظیم الشان المیہ کی ایک پوری جھلک نظر آجائے گی۔

آج سے ہزاروں سال پہلے جب ہندوستان کی قدیم تاریخ کی سب سے بڑی

سب سے اہم لڑائی کوروؤں اور پانڈوؤں کے درمیان لڑی گئی تھی۔ اس کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا...... میرے سینے پر حق و باطل کی یہ جنگ لڑی گئی اور میری گود میں حق کی فتح ہوئی اور باطل ناکام ثابت ہوا۔ اور پھر ہزاروں برس بعد بہت سے بڑے بڑے سیاسی کھیل میرے سینے پر کھیلے گئے۔ بہت سی تاریخی جنگیں میرے میدانوں میں واقع ہوئیں۔ کیونکہ ہندوستان کی راج دھانی دہلی کی حفاظت کیلئے سورما ہمیشہ میرے ہاں آکر سینہ سپر ہوتے تھے۔ بابر اور ابراہیم لودھی کی جنگ جس میں بہادر بابر نے عیش پرست اور زوال آمادہ لودھی خاندان کو شکست دی۔ یہ پانی پت کی پہلی لڑائی کہلاتی ہے۔ اس کے بعد پانی پت کی دوسری لڑائی میں ہندوستان کے سپوت اکبر نے ہیمو کو نیچا دکھایا۔ لیکن اس کی شجاعت نے ہارے ہوئے دشمن کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنا گوارا نہ کیا۔

اور پھر پانی پت کی تیسری تاریخی لڑائی۔ احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے درمیان ہوئی۔ اس میں بھی خون کی ندیاں میرے سینے پر بہیں، لاشوں کے ڈھیر میری گود میں پڑے رہے اور میں خون بھری آنکھوں سے انسانوں کی اس باہمی مخالفت اور خوں ریزی اور بادشاہوں کی جاہ پرستی کے نتیجے دیکھتا رہا..... کہ چند آدمی سلطنت اور طاقت کی خاطر ہزاروں بہادر، جاں باز نوجوانوں کا خون کس بے پروائی اور بے حسی سے بہا دیتے ہیں اور ان کے دل پر کوئی چوٹ نہیں لگتی، ضمیر میں کوئی خلش نہیں ہوتی

خون کی یہ ہولی بے شک خوفناک ہوتی تھی، لیکن ان میں پھر بھی شاید کچھ شرافت اور بہادری کا جذبہ تھا۔ فوجیں آپس میں لڑتی تھیں۔ لیکن آداب جنگ کی پابندی کے ساتھ۔ سپاہی ایک دوسرے سے لڑتے مرتے، مارتے تھے لیکن

جنگ انہیں تک محدود رہتی تھی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ان لڑائیوں میں سپاہیوں نے کبھی بڑے پیمانے پر عورتوں، بچوں، یا اپاہجوں پر ظلم وستم توڑے ہوں، تمام لوگوں کی عافیت تنگ کی ہو، درندوں کی طرح نہتوں کا شکار کیا ہو۔ وہ آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ تلوار کے زور سے کرتے تھے اور ہار جیت کے بعد اکثر ایک دوسرے سے ان کا سلوک وہی ہوتا تھا جو کسی شریف فاتح کا بہادر مفتوح کے ساتھ ہونا چاہیے معاف کیجئے گا میں ان مٹی ہوئی باتوں اور جنگوں کا ذکر اس سراہنے کے انداز میں اس لئے کر رہا ہوں کہ مجھے آگے چل کر ایک اور لڑائی کا حال آپ کو سنانا ہے جس میں ساری پرانی وضع داریاں اور پابندیاں خاک میں مل گئیں اور میری آنکھوں نے وہ دیکھا جس کی بدولت آج میں اندھا ہونا پسند کروں گا۔

آپ نے کپڑے کے ایسے تھان دیکھے ہوں گے جس میں تانا اور بانا مختلف رنگ کا ہوتا ہے اور اس رنگا رنگی کی وجہ سے کپڑے کی خوبصورتی بڑھ جاتی ہے۔ میرا حال بھی مدت سے ایسا ہی رہا ہے۔ ہندو اور مسلمان کے تانے بانے سے میری ذات نے اپنی قبائے صفات تیار کی تھی۔ ہندو تو ہزاروں برس سے، مہابھارت کے زمانے سے میرے ہاں رہتے آئے تھے۔ لیکن پچھلے ہزار برس سے مسلمانوں نے آکر میری گود میں پناہ لی، مجھے اپنا وطن بنایا اور میرے ہو رہے۔ اس کا قصہ بھی دلچسپ ہے۔

آج سے تقریباً ہزار سال پہلے چند مسلمان عالموں کا گروہ میرے ہاں آیا۔ وہ یہاں رہنا اور اپنے مذہب کی تعلیم پھیلانا چاہتے تھے۔ مگر ایک مقامی راجہ نے ان کی مخالفت کی۔ ان میں ایک مختصر سی لڑائی ہوئی اور اس کے بعد ان عالموں نے یہیں ڈیرہ ڈال دیا۔ اور وہ اور ان کی اولاد یہاں بس گئی...... ان میں سے اکثر بزرگوں کے مزار آج

بھی میرے ہاں زیارت گاہ بنے ہوئے ہیں۔

رفتہ رفتہ میری آبادی میں مسلمانوں کا اضافہ ہوتا گیا۔ پھر تقریباً آٹھ سو برس گزرے ایران سے ایک شخص ہندوستان آیا۔ اس کا نام خواجہ ملک علی تھا۔ اُسے وہاں کے لوگوں نے ستا کر ترک وطن پر آمادہ کیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک بے ضرر اور شریف آدمی ہے۔ اس لئے میں نے اُسے اپنے دامن میں پناہ دی اور اس نے اور اس کی اولاد نے اس احسان کو اس قدر مانا کہ وہ ہمیشہ میرا نام اونچا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ خاندان، اُس دن سے آج تک، میرا سب سے شریف، عزت دار اور مشہور خاندان سمجھا جاتا ہے۔ اس میں ہر زمانے میں بہت سے نیک اور شریف اور مشہور لوگ پیدا ہوئے، جن سے مجھے نیک نامی حاصل رہی۔ ان میں سے بعض سے میں آپ کا تعارف کراؤں گا۔

میری ہمیشہ ایک بڑی خصوصیت ایسی رہی ہے جس پر مجھے بجا طور پر فخر ہے۔ میرے ہاں ہندوؤں اور مسلمانوں اور سب قوموں کے تعلقات ہمیشہ خوش گوار رہے ہیں۔ عرصے سے میری آبادی میں تین چوتھائی مسلمان اور ایک چوتھائی ہندو رہے۔ لیکن ان میں کبھی کوئی قابل ذکر لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔ بلکہ ہمیشہ آپس میں سلوک و اتفاق رہا، محبت اور رواداری رہی۔ جب میرے ہاں مسلمانوں کی حکومت تھی تو وہ اپنے کو ہندوؤں کا دوست اور ان کی حفاظت کا ذمہ دار سمجھتے تھے اور ہندو ان پر بھروسہ اور ان سے محبت کرتے تھے۔ جب میرے میدانوں میں جنگیں ہوتیں اور حملہ آوروں سے ہندوؤں کو خطرہ پیدا ہوتا تو میرے مسلمان اپنے ہندو بھائیوں کی حفاظت کرتے اور کسی حملہ آور کی مجال نہ ہوتی تھی کہ میرے پُرامن شہریوں کو ستائے یا

مذہب کے اختلاف کی بنا پر ہندوؤں پر ظلم کرے۔ میرے سب باشندے ہمیشہ پرسکون زندگی کے دلدادہ رہے ہیں۔ انھیں نہ آپس میں لڑنے مرنے کا مرض تھا نہ باہر کے لوگوں سے جنگ وجدل کرنے کا لپکا۔ اگر کبھی کبھی کچھ ایسے فسادی پیدا ہو جاتے تھے تو شہر کے سمجھدار اور امن پسند لوگ ان کو دبا کر رکھتے تھے اور وہ امن عامہ میں خلل نہ ڈال سکتے تھے۔

آپ کو تو یاد ہو گا ۱۸۵۷ء کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں کتنا خطرناک، کتنا پر آشوب زمانہ گزرا ہے۔ اور شمالی ہند میں تو اس وقت بالکل ہی قیامت کا سا سماں تھا۔ دہلی اور میرٹھ اور آس پاس کے علاقے میں سال بھر تک وہ خونیں ڈرامہ کھیلا جاتا رہا جسے تاریخ میں غدر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن میری بستی اس وقت بھی پرامن اور محفوظ رہی۔ جب ہندوستانی فوجیں انگریزوں سے جنگ کر رہی تھیں اور کہیں کہیں انگریز مرد اور عورتوں پر ظلم توڑے جا رہے تھے اس وقت بھی میں نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ اور پھر جب حالات نے پلٹا کھایا، مظلوم ظالم اور زیردست زبردست بن گئے، جب فرنگیوں نے اس "بغاوت" کو کچلنے کا فیصلہ کر لیا اور "باغیوں" پر شدید ظلم ہونے لگے، جب انگریزوں نے ہندوستانیوں کو اندھا دھند گولی سے مارنا اور سولی پر چڑھانا شروع کیا، جب ہر خود غرض لالچی مخبر کی بات کا اعتبار کر کے بے گناہوں کو پھانسی دی جانے لگی......... اُس وقت دہلی کے مصیبت زدہ، بے وطن خانماں برباد لوگوں کے لئے میں نے اپنی گود کھول دی۔ وہاں کے سینکڑوں آفت نصیب مرد اور عورتیں اور بچے آئے اور انھوں نے میرے ہاں پناہ لی۔ افسروں اور بے ایمان مخبروں نے لاکھ لاکھ کوشش کی کہ وہ میرے ان پناہ گزینوں کا پتہ چلائیں

لیکن میرے بہادر، رحم دل اور مہمان نواز سپوتوں کی بدولت جو مہماں کے لئے جان دینے پر تیار تھے، وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ محلوں اور گھروں کی تلاشیاں ہوئیں مگر میں نے جن مہمانوں کو سر آنکھوں پر رکھا تھا وہ ان کا سُراغ نہ لگا سکے۔ آپ تعجب کریں گے کہ ایسا کیوں کر ہوا؟ بات یہ ہے کہ اس وقت ملک والوں میں باہمی اتحاد اور محبت وہمدردی تھی۔ اپنی ذمہ داریوں کا احساس تھا۔ وہ دوسروں کی مصیبت کو اپنی مصیبت سمجھتے تھے —— اسی لئے یہ بستی اس خطرناک زمانے میں بھی محفوظ رہی۔ افواہیں اڑائیں کہ پانی پت کا شہر "توپ سے اڑا دیا جائے گا۔" یہاں کے ایک ایک آدمی کو چن چن کر مار ڈالا جائے گا لیکن کسی طرح وہ وقت بھی گزر گیا اور خدا خدا کر کے پھر امن قائم ہوا۔ میرا ضمیر مطمئن تھا کہ میں نے قدیم ہندوستانی شرافت اور عرب کی مہمان نوازی کی روایتوں کو قائم رکھا ہے۔

اور پھر کئی سال تک ملک پر فالج کی سی کیفیت طاری رہی اور جب سیاسی ہوش آنا شروع ہوا تو غیر ملکی حکومت نے اپنا اثر بڑھانے اور اپنی حکومت کی بنیادیں پختہ کرنے کے لئے اپنا سب سے کارگر جادو میدان میں پھینکا یعنی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" بھائی بھائی کے درمیان نفاق پیدا کر دو اور خود چین کی زندگی بسر کرو۔ ہم نے نفرت کے اس بیج کو پالا جو آج ایک تناور درخت بن گیا ہے۔

سارے ہندوستان میں جگہ جگہ مندر اور مسجد پر، محرم اور دسہرے پر، گائے اور پیپل پر جھگڑے ہونے شروع ہو گئے۔ نام خدا کا اور مذہب کا لیا جاتا اور کام شیطان کا کیا جاتا۔ باہر سے بعض لوگ میرے ہاں بھی پہنچے اور انھوں نے ایسی تحریکیں اٹھائیں جن سے ہندو مسلمانوں کے تعلقات پہلے سے نہ رہے کچھ

کشیدگی، بے اطمینانی اور مغائرت پیدا ہونی شروع ہو گئی۔ لیکن پھر بھی اُن کے آپس کے تعلقات کبھی واقعاً خراب نہیں ہونے پائے۔ ۱۸۸۶ء میں سارے ہندوستان میں دسہرے اور محرم کے موقع پر فساد ہوئے۔ لیکن میرے یہاں امن رہا۔ دوستی کی روایتوں نے شرارت کی سازشوں کو نہیں چلنے دیا۔ میری دونوں آنکھوں کے تارے ہندو اور مسلمان شانتی اور میل جول کے ساتھ اپنا کار و بار کرتے رہے۔

جیسا کہ آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا، دلی سے میرا قدیمی اور قریبی تعلق رہا ہے دلی کے لوگ میرے ہاں اور میرے دلی، ہمیشہ اس طرح آتے جاتے ملتے جلتے رہے۔ جیسے ایک محلے والے دوسرے محلے والوں سے۔ دلی کا لباس، دلی کی خوراک، دلی کا رہن سہن دلی کی زبان غرض دلی کی تہذیب کی بہت سی باتیں میری تہذیب میں جذب ہو چکی ہیں کہنے کو میں پنجاب کے صوبے میں شامل ہوں مگر یہ در اصل صوبوں کی تقسیم کرنے والوں کی ستم ظریفی تھی کہ مجھے پنجاب میں ملا دیا۔ لباس، زبان، تہذیب، تمدن وغیرہ کے لحاظ سے مجھ میں اور پنجابی شہروں میں بہت کم اشتراک ہے۔ در اصل میرا دل تو دلی سے ملا ہوا ہے اور میری آنکھ دلی سے لڑی ہوئی ہے۔ کہنے والے کہتے تھے، "پانی پت تو دلی کا ایک محلہ ہے!" اور صحیح کہتے تھے۔

پھر بھی مجھ میں اور دلی میں ایک بڑا فرق تھا۔ میں دلی کی نفاست، دلی کی بناوٹ، دلی کے تکلف اور دلی کی تہذیب کی چمک دمک سے محروم تھا (بعض لوگ کہیں گے محفوظ تھا) میرے ہاں اس کے بجائے سادگی، خلوص، صاف گوئی اور صاف دلی تھی۔ ایک چھوٹے سے قصبے میں دلی کی چہل پہل، دلی کی تفریح، دلی کی عیش عشرت دلی کی آرائش، دلی کے سینما اور تھیٹر کہاں سے آئیں؟ دلی کی جامع مسجد، موتی

مسجد، ہمایوں کا مقبرہ، قلعہ معلی، پرانا قلعہ اور چاندنی چوک میرے ہاں کہاں؟ پرانے زمانے کی ایک جامع مسجد، قلندر صاحب کا مزار، مخدوم صاحب کا مزار، چند مسجدیں اور امام باڑے جو مسلمانوں کے مذہبی لگاؤ کی یادگار ہیں۔ جینیوں کا ایک خوبصورت مندر، بس یہی میری قابل دید عمارتیں ہیں۔ یہ ثبوت ہیں اس بات کا کہ میرے باشندے اپنے مذہب کے دلدادہ، اپنے بزرگوں کا احترام کرنے والے اور ان کی یادگار باقی رکھنے والے تھے۔

میرے ہاں عام تعلیم کا زیادہ چرچا نہیں رہا۔ مذہب کی لگن کی وجہ سے مذہبی تعلیم کا ہمیشہ زور رہا اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں جس قدر قرآن کے حافظ پانی پت میں تھے اس قدر کسی اور شہر میں نہیں پائے جاتے۔ اور ان کی قرات کی تو عرب تک دھوم اور تعریف تھی! مروجہ انگریزی تعلیم صرف انٹرنس تک تھی۔ لیکن خواندگی کا عام معیار بہت کم تھا۔ البتہ میرے بعض سپوتوں نے پانی پت سے باہر جا کر، ولایت تک جا کر، اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور نام پیدا کیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ میں اس لحاظ سے دلی یا کسی بڑے شہر کا بھی، مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ باوجود ان تمام کوتاہیوں اور محرومیوں کے مجھ میں کبھی احساس کمتری پیدا نہیں ہوا۔ میری کچھ ذاتی خصوصیات ایسی تھیں جن کی وجہ سے مجھے خود پر اعتماد اور ناز تھا۔ افسوس کہ آج وہ بھی جاتا رہا۔

آپ پوچھیں گے وہ کیا ایسی خصوصیات تھیں؟ میرے لئے مشکل ہے کہ میں اس نفسیاتی مرقع کو پیش کر سکوں جو پانی پت میں تھا یا آپ کو اس تہذیب کے خدوخال دکھا سکوں جو چند ہفتے کے اندر میری پتھرائی ہوئی آنکھوں کے سامنے دم توڑ

گئی۔ واقعاً میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ نقشہ آپ کے سامنے کس طرح کھینچوں۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ میری تہذیب میں جہاں بہت سی کمزوریاں اور کوتاہیاں تھیں، وہاں ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں شہری تہذیب اور دیہاتی تہذیب کی بعض اچھی باتیں بڑی خوبی کے ساتھ گھل مل گئی تھیں اور شہری تہذیب کے بہت سے نقائص اور دیہاتی زندگی کی بہت سی برائیوں سے میرا دامن پاک تھا۔ میں سنگم تھا شہر اور دیہات کا، نئی اور پرانی تہذیب کی قدروں کا، میں حامل تھا قدیم اور جدید اخلاقی صفات کا۔ میرا یہ دعویٰ ہرگز نہیں کہ مجھ میں شہری اور دیہاتی تمدن کی خوبیاں ہی خوبیاں تھیں۔ نہیں مجھ میں بہت سے نقص اور کمزوریاں بھی تھیں۔ مثلاً میری گلیاں اور سڑکیں تنگ، ٹوٹی پھوٹی اور غبار آلود تھیں، میرے بازار ناصاف اور دکانیں حفظانِ صحت کے اصولوں سے ناواقف تھیں۔ مکھیاں اور مچھر اور ان کی لائی ہوئی بیماریاں میرے ہاں عام تھیں اور لوگ ان کو اٹل سمجھ کر قبول کر لیتے تھے۔ میرے ہاں جدید تمدن کی بہت سی سہولتیں ناپید تھیں۔ کہنے کو پانی اور بجلی تھی، لیکن میونسپلٹی کی بے ایمانی، لاپروائی اور بے عملی کی بدولت میرے باشندوں کو کبھی صاف پانی، اچھی روشنی، صفائی اور صحت میسر نہ ہوئی۔ میرے ہاں تعلیم کی کمی تھی اور اس کی وجہ سے توہم پرستی، غربت، قدامت پسندی، روایاتی مذہب کی لفظی پابندی، نئے خیالات کی طرف سے شک اور خوف لوگوں میں عام تھے۔ قناعت بے عملی اور بے حسی کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ امنگ، حوصلہ، ترقی کا وہ ولولہ جو افراد اور جماعتوں کو آگے بڑھاتا ہے مقابلتاً کم تھا۔ اس وجہ سے انقلاب نے جو زندگی کی رفتار کو بڑھاتا اور اس کی نبض کو تیز کرتا ہے، میرے ہاں بہت کم اثر ڈالا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ میرے ہاں کچھ خوبیاں بھی تھیں، خاص خوبیاں۔ ممکن ہے آپ کی نظر میں وہ

کوئی اہمیت نہ رکھتی ہوں۔ لیکن ان کو بھی سن لیجئے ؎

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو!

میرے ہاں خاندانوں کے افراد ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ تھے جیسے تسبیح کے دانے۔ وہ الگ الگ ہوتے ہوئے بھی ایک تھے۔ وہ کہیں ہوتے، کہیں رہتے لیکن ان کے دل میں خاندان کی محبت، اہل وطن کی یاد، وطن سے لگاؤ اور اس کی بہبودی کی لگن ہمیشہ رہتی تھی۔ میرے ہاں خاندان کا مفہوم چند قریبی رشتے داروں تک محدود نہ تھا، بلکہ دور دور کے عزیز اور برادری کے افراد جن سے کئی کئی پشت پہلے کوئی رشتہ داری رہی ہو، خاندان میں شامل تھے۔ سب لوگ ایک دوسرے کو پہچانتے، ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور ضرورت پڑنے پر ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ امیر غریب میرے ہاں بھی تھے، ان میں جو عیب ہوتے ہیں کم و بیش وہ بھی موجود تھے، پھر بھی ان میں آپس میں ایک خاص ہمدردی اور لگاؤ کا جذبہ موجود تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ خاندان اور برادری میں کسی غریب کے ہاں کوئی خوشی یا غمی کا موقع ہو اور اُس کے خوش حال عزیز اور دوست اس میں حصہ نہ لیں یا مصیبت و ناداری میں اس کی مدد نہ کریں۔ ایک طرف غریبوں کی غیرت اور خودداری قابل قدر تھی، تو دوسری طرف پیسے والوں کا (کم سے کم بعض کا) خاموشی اور انکسار کے ساتھ ان کی مدد کرنا بھی قابل تعریف تھا۔ میرے ہاں پرانے پیشوں اور طبقوں کی تقسیم چلی آتی تھی اور لوگ بغیر کسی تحقیر کے، بغیر سمجھے بوجھے، پیشہ وروں مثلاً نائی، دھوبی، سقے، مہتر وغیرہ کو "کمین" کہتے تھے۔ اور یہ سب لوگ بظاہر چند پیسوں بلکہ اناج کے چند دانوں کے عوض سال بھر اپنے "ججمانوں" کی خدمت کرتے تھے۔ اور سماجی لحاظ سے بہت سے ججمان ان کو اپنے سے گھٹیا اور کمتر سمجھتے تھے۔ ان سے خوب کام لیتے اور ان کو برا بھلا کہتے اور ڈانٹتے

ڈپٹنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ بات بہت قابل اعتراض نہیں ہے لیکن پیچ یہ ہے کہ یہ زبانی اور سطحی برائیاں تھیں جو باہمی تعلقات کی اصلی نوعیت کو ظاہر نہیں کرتیں۔ دراصل ان میں آپس میں کافی ہمدردی اور یک جہتی کا احساس تھا۔ یہی لوگ اپنی مذمت کرنے والوں کو تقریبوں میں کپڑا اور زیور اور کھانا اس افراط اور خوش دلی سے دیتے کہ ایک حد تک اجرت کی کمی کی تلافی ہو جاتی۔ پھر بیماری و پریشانی میں، شادی و غمی میں "ججمان" اور "کمین" ایک دوسرے کے اس طرح شریک ہوتے اور اس بے تکلفی اور خلوص سے ان میں حصہ لیتے کہ لباس اور وضع قطع کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ سمجھنا مشکل تھا کہ ان میں ذات پات اور بلند و پست کا کوئی خاص فرق تھا۔ ایک پرانے سماجی نظام نے، سماجی محرومیوں کی تلخی کو دور کرنے اور اس کی سختیوں کو کم کرنے کے لئے جو روایتیں اور طریقے رائج کئے تھے وہ یہاں جاری تھے۔ اور اگرچہ آج کے ترقی پسند انقلابی ان پر ناک بھوں چڑھائیں گے (اور شاید ٹھیک ہی کریں گے) لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ ان کی حالت بڑے بڑے شہروں کے مزدوروں اور پیشہ وروں سے بہت بہتر تھی۔ جن کو شاید اجرت کے طور پر زیادہ سکے ملتے ہوں۔ لیکن آقا اور ملازم کی اٹل دیواریں دونوں کو الگ الگ قید رکھتی ہیں۔

میرے ہاں بھی ساس بہو، نند بھاوج، میاں بیوی کی لڑائیاں تھیں۔ بہن بھائیوں اور ماں باپ اور اولاد کے خیالات کے اختلاف تھے۔ لیکن باوجود ان مخالفتوں کے، باوجود ناراضگیوں اور خفگیوں کے ان میں آپس میں محبت اور باہمی تعلق تھا جس کو روزمرہ کے لڑائی جھگڑے نظر سے اوجھل کر دیں لیکن ختم نہ کر سکتے تھے۔ جہاں کسی پر کوئی مصیبت، یا دُکھ، یا غم، پڑا لڑائی جھگڑا غائب اور سب اس کے مقابلے کے لئے صف بستہ

وہ دوسرے کی مصیبت بٹانے، اُس کے غم میں شریک ہونے اور اُس کا دُکھ دور کرنے کے لئے بے چین۔ بے شک ان کی زندگی محدود تھی، اس میں وسعت نہ تھی، لیکن اس میں گہرائی تھی۔ اس میں ایک مشترک انسانیت کا احساس تھا، اس میں کمزور اور غریب کی امداد اور حفاظت کا جذبہ تھا، اس میں جمعیت کا وہ جذبہ تھا جو فرد کو تنہائی کی بے بسی سے نکال کر جماعت کی قوت اور اعتماد کا شریک بنا دیتا تھا۔

میرے ہاں کے پڑوسیوں کے تعلقات آپس میں بہن بھائیوں سے زیادہ تھے۔ وہ ایک دوسرے کے برابر اور ساتھ رہتے تھے اس لئے عزیزوں سے زیادہ ایک دوسرے کے دُکھ سکھ میں شرکت کرتے، ہر وقت کے آنے جانے، ملنے جلنے، لین دین، صلاح مشورے کرتے رہنے کی بدولت ان کے تعلقات میں پائیداری اور گہرائی پیدا ہو جاتی تھی۔ غیر قوم، غیر مذہب، امیر غریب، "جمان"۔ "کمین" ہونے سے پڑوسیوں کے تعلقات پر کوئی برا اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ پڑوسی تو پڑوسی ہی ہے خواہ وہ کوئی ہو۔ "حق ہمسایا ماں کا جایا"، "اپنے دور پڑوسی نیڑے" میرے ہاں کی محبوب کہاوتیں تھیں۔

اور میرے ہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں، جیسا میں نے پہلے کہا ہے، آپس میں کبھی کبھی کشیدگی اور بدگمانی پیدا ہوتی تھی۔ کہاں نہیں ہوتی؟ پھر بھی وہ ایک دوسرے کے دوست اور ہمدرد تھے۔ وہ ایک دوسرے کے تہواروں اور تقریبوں میں حصہ لیتے، دُکھ درد میں شریک ہوتے۔ میرے ہاں کا کوئی ہندو کسی غیر شہر میں اپنے ہم وطن مسلمان کو دیکھ کر اس سے لپٹ جاتا اور میرا مسلمان غیر شہر میں اپنے ہم وطن ہندو کو دیکھ کر خوشی سے کھل جاتا۔ ایسا کیوں نہ ہوتا؟ آخر وہ دونوں میری ہی اولاد تھے۔ انھوں نے

میری ہی گود میں پرورش پائی تھی۔ ان کا رہن سہن، ان کا کھانا پینا، ان کی زبان، ان کا لباس، ان کی بھلائیاں اور برائیاں سب ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھیں۔ وہ دونوں اپنے مذہب میں پکے تھے، لیکن مذہب کے فرق کے باوجود ایک دوسرے کی انسانیت کے معترف تھے۔

میرے بچوں کو مجھ سے محبت تھی۔ وہ کسی جگہ ہوتے، کہیں رہتے، مجھ سے محبت کرتے۔ میری بیٹیاں اپنے میکے آنے کے لئے تڑپا کرتیں، میرے بیٹے اپنے وطن دوڑ دوڑ کر آتے، محرم پر، دسہرے پر، عیدین، شادی میں، غمی میں۔ میرے یہ چاہنے والے بہانہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے محبوب وطن میں آتے۔ ایک دوسرے سے ملتے جلتے، ہنستے بولتے، روتے دھوتے اور تر و تازہ ہو کر واپس جاتے۔ ہاں یہ مجھ پر فخر کرتے تھے، مجھ سے محبت کرتے تھے۔ میرے کچھ ایسے سپوت بھی ہیں جن پر صرف میں ہی نہیں سارا ہندوستان فخر کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔ جن کی بدولت قدر شناسوں نے کہا کہ "پانی پت تو جواہر اُگلتا ہے"۔ آئیے ان میں سے آپ کو بھی چند سے ملا دوں۔

قلندر صاحب کا نام سنا ہے آپ نے؟ آج سے آٹھ سو برس پہلے کا ذکر ہے۔ بو علی قلندر نام کا ایک شخص تھا جسے لوگ مجذوب سمجھتے تھے! لیکن ایسا مجذوب جس کی مجذوبیت پر ہزار عقل و ہوش نثار ہیں۔ مذہبی پیشواؤں نے ظاہر کو دیکھ کر اس کے قتل کا فتویٰ دے دیا۔ لیکن پھر اس کے عالم جذب اور کرامات کو دیکھا تو دم بخود رہ گئے اور اس کی ولایت کو تسلیم کرنا پڑا۔ اور آج اس بزرگ کا مزار سارے ہندوستان کے لئے زیارت گاہ ہے اور خوش عقیدہ لوگ یہاں آکر اپنی حاجتیں مانگتے ہیں۔ اس

امید میں کہ شاید حداوانوں کے ذریعے خدا تک رسائی ہو جائے۔

یہ تو پرانا قصّہ ہے جب جذب کے ذریعے کرامتیں دکھائی جاتی تھیں۔ اب آپ کو اپنے ایک اور سپوت کا ذکر سناؤں، جس نے اپنی ادبی کرامت سے ایک سوئی ہوئی قوم کو جگا دیا، اس کی نبض میں تازہ خون دوڑا دیا۔ ہندوستان میں کون ایسا تعلیم یافتہ شخص ہے جس نے الطاف حسین حالی کا نام نہیں سنا ہو۔ جو اس کی عظمت، اس کی ادبی قابلیت اور اس کی بے مثل علمی اور قومی خدمات کا معترف نہ ہو۔ جدید شاعری کا امام، تنقید کا مجدد، سیرت نگاری کا ماہر، اردو زبان کا مستند ادیب، مسدس کا شہرۂ آفاق اور محبوب مصنف...... پہلا اور سب سے بڑا ترقی پسند شاعر...... یہ تھا حالیؔ! میرا سپوت، جس نے میرا نام ساری دنیا میں روشن کیا۔ جس نے مسلمانوں کی کھوئی ہوئی عظمت کا مرثیہ پڑھا اور انھیں مستقبل کی طرف مائل کیا۔ اس نے ملک کی نبض کو پہچانا اور ساری قوم کو اتحاد و اتفاق، محنت اور دیانت داری کا سبق پڑھایا۔ وہ جدید تعلیم کا حامی، عورتوں کے جذبات کا ترجمان اور ان کے حقوق کا علم بردار اور زندگی کی بہترین قدروں کا مفسر تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی اپنی سیرت اس قدر بلند اور پاکیزہ تھی وہ اس قدر ہمدرد، مخلص، شریف، نیک دل اور مخیر انسان تھا جس پر دنیا کی ہر قوم اور ملک فخر کر سکتا ہے۔ پھر اگر میں حالیؔ پر فخر کروں تو کیا بے جا ہے؟

اور پھر...... اسی حالیؔ کے خاندان سے اور بہت سے نوجوان ابھرے۔ ایک نے عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر سچے انصاف اور فرض شناسی کے جوہر دکھائے۔ ایک عالم دین بنا۔ ایسا مخلص اور روشن خیال عالم جس نے مذہب کو نئی روشنی میں بھٹکتے ہوئے دماغوں کے لئے بھی قابل قبول بنا دیا۔

ایک اور نوجوان کی سیاسی سوجھ بوجھ، علمی اور دماغی قابلیت، سماجی خدمت کے ذوق اور ولولے اور تصنیف وتالیف کے کارناموں نے کل چالیس سال کی عمر میں سارے ملک میں اپنا سکہ بٹھا دیا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو نہ معلوم ملک اور قوم کی کیا کیا خدمات انجام دیتا۔ قومی کام کی دُھن میں اُس نے اپنی صحت تج دی اور جوانی ہی میں خدا کو پیارا ہوا۔

اور پھر تعلیمی کام کرنے والوں میں سے حالی کے بیٹا، سجاد حسین سے بھی واقف ہیں؟ علی گڑھ کالج کا پہلا گریجویٹ، یونین کا پہلا صدر، کرکٹ کا پہلا کپتان جس میں مشرقی اور مغربی تعلیم اور تہذیب کی ساری خوبیاں جمع ہو گئی تھیں۔ جو اپنے باپ کی سیرت کی ساری خوبیوں کا حامل اور ایک درد مند، محبت بھرے فیاض دل کا مالک تھا جس نے اپنی اسی سالہ زندگی میں سے ساٹھ سال نہایت خاموشی استقلال اور ہمت کے ساتھ، بندگانِ خدا کی خدمت اور بہبود میں گزار دئے۔ جوانی، پنجاب اور سرحد میں تعلیم کے پھیلانے اور بڑھانے میں گزاری اور عمر کے آخری تیس سال اپنے شہر کے جاہل اَن پڑھ لوگوں میں تعلیم کا شوق پیدا کرنے اور ان کے بچوں کو تعلیم دینے میں..... "حالی مسلم ہائی سکول" ـــــــ اُس کے اس تعلیمی جہاد کا کارنامہ تھا۔ کس مضبوطی، خندہ پیشانی اور بے مثل صبر کے ساتھ اس راستے کی ساری کٹھنائیوں ساری مصیبتوں کو جھیلا اور ان پر قابو پایا۔ وہ شہر کا سب سے محبوب، سب سے محترم، سب سے اچھا انسان سمجھا جاتا تھا امیر، غریب، دوست، دشمن، دیسی، پردیسی، ہندو، مسلمان، چھوٹے بڑے سب اُسے چاہتے تھے۔ وہ سب کو چاہتا تھا سب اس سے مدد اور مشورہ مانگتے تھے۔ اور وہ سب کی مدد کے لئے دل وجان سے تیار رہتا تھا۔ ہر طرح کے لوگ اس کے پاس آکر بیٹھتے

اپنی رام کہانی سناتے، اس کی نصیحت اور شفقت بھری باتیں سنتے، جس میں مذہب سے پائی ہوئی معرفت کی روشنی اور آتاہ ہمدردی کی چاشنی ہوتی۔ اور جب وہاں سے اُٹھتے تو دل میں سکون و اطمینان و اعتماد کی دولت لے کر اٹھتے۔

اور آج بھی میرے ایسے ہونہار سپوت موجود ہیں جن کی علمی، ادبی، تعلیمی قومی اور ملکی خدمات پر میرے ساتھ سارا ہندوستان فخر کر سکتا ہے...... بے شک میں ایک چھوٹی سی بستی ہوں۔ لیکن جو بستی ایسے ایسے جواہر اگل سکے ـــــ وہ کیوں اپنے کو حقیر اور کم مایہ سمجھے؟

مگر مجھے صرف اپنے مشہور اور نام آور سپوت ہی عزیز نہیں، میں صرف ان ہی پر فخر نہیں کرتا بلکہ میرے ہاں بہت سے ایسے غیر معروف، گم نام لوگ بھی ہوئے ہیں جنھوں نے میری نیک نامی کے چراغ کو روشن رکھا ہے۔ خاموشی کے ساتھ۔ نام و نمود کی خواہش سے دور رہ کر۔ لوگوں کی سچی خدمت کرنے میں اپنی زندگیاں بسر کی ہیں جن کو دنیا نہیں جانتی پر میں جانتا ہوں کہ ان کی خدمت رائگاں نہیں گئی......

قوموں کی تعمیر اور انسان کو انسان بنانے میں ان گم نام تعمیری کام کرنے والوں کا حصلہ سب سے زیادہ اہم اور قابلِ قدر ہوتا ہے۔

اور ان ہی لوگوں میں میرے ہاں کی عورتیں بھی ہیں۔ میں خاص طور پر ان عورتوں کو دھن یاد دیتا ہوں۔ اَن پڑھ، جاہل، نئی روشنی اور نئی تعلیم سے بیگانہ عورتوں کو! اگر آپ ان عورتوں کو جانتے تو سمجھ جاتے کہ میرے ہاں ایسے ایسے ہونہار سپوت کیسے پیدا ہوئے ؟ ان عورتوں میں باوجود مروجہ تعلیم نہ ہونے کے بڑی خوبیاں تھیں۔

جو ہندوستان کی پرانی تہذیب کی دین تھیں۔ مذہب کی لگن اور اس کی وجہ سے خدا کا خوف اور اس کے بندوں کے ساتھ ہمدردی، کفایت شعاری اور صفائی پسندی ہمدردی اور خلوص، دوسروں کے دُکھ کا احساس اور ان کی مدد کے لئے آمادگی۔ یقیناً ان میں سے بیشتر قدامت پرست تھیں، جاہل تھیں، رسم ورواج کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ لیکن پھر بھی ان میں حقیقی فرض شناسی اور اخلاق کی پابندی تھی۔ ان میں سے بہترین تو ان تمام اخلاقی قدروں کی حامل تھیں جو آدمی کو انسان بناتی ہیں۔ بحیثیت بیویوں کے شوہر کی غم گسار، بحیثیت بیٹی کے ماں باپ کی اطاعت گزار، بحیثیت بہنوں کے بھائیوں کی جانثار، بحیثیت ماں کے فرض شناس اور عاشق زار دلوں میں اتنی فراخی اور گہرائی کہ ایک عالم کا دُکھ درد اس میں سما جائے۔ انھیں اپنے حقوق کی نہ پروا تھی نہ ان سے واقفیت۔ انھیں تو اپنے فرض کو ادا کرنے کی دُھن تھی۔ اور اگر ان کے بزرگ ان پر ضرورت سے زیادہ فرائض کا بار ڈال دیتے تو اس وقت بھی اُن کی جبیں شکن آلود نہ ہوتی۔ میں جانتا ہوں کہ یہ حقوق طلبی کا زمانہ ہے، عورتوں کو بھی یہی فکر لگی رہتی ہے۔ لیکن مجھے معلوم نہیں کہ فرض کے بجائے حقوق پر زیادہ زور دینے کی بدولت دنیا پہلے سے زیادہ دکھی ہے یا سکھی! انھوں نے دنیا میں خود کوئی شہرت نہیں پائی۔ لیکن ان کی سیرت کی روشنی نے ان کی اولاد کی زندگیوں کو روشن بنا دیا۔ اور ان کی بدولت میرا نام دنیا میں چمکا۔ انھیں ماؤں کی بدولت ان کی بیٹیاں شادی کے بعد سسرال میں کامیاب زندگی بسر کرتی تھیں اور انھیں کے فیضِ تربیت سے وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں میں عزت اور محبت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں۔

آیئے آپ کو اپنے ہاں کی زندگی کے کچھ مناظر دکھاؤں۔ کس قدر محبوب تھے مجھے یہ دلکش مناظر.....

میرے ہاں کے مسلمان محرم ہمیشہ بہت زور شور سے مناتے تھے۔ پہلی محرم سے بیسیوں گھروں اور امام باڑوں میں مردانی اور زنانی مجلسیں ہوتیں۔ دن اور رات، صبح دوپہر اور شام! جن میں بچے اور بڑے، جوان اور بوڑھے، ہندو اور مسلمان، سنّی اور شیعہ سبھی شریک ہوتے۔

یہ دیکھو۔ محلہ سادات کا ایک مختصر سا مکان ہے۔ چار بجے کا وقت ہے۔ اس میں زنانی مجلس ہو رہی ہے۔ ایک لڑکی انیس کا مرثیہ پڑھ رہی ہے۔ کمرہ، دالان، صحن دروازے، گلی اور اس کے آگے سڑک عورتوں اور بچوں سے جن میں بہت سے غریب اور ناداریں بھری پڑی ہے۔ ان کے شور و غل اور دھکا پیل کی وجہ سے مجلس سننا بھی مشکل ہے لیکن کیا مجال ہے کہ کوئی انسان کو وہاں سے ہٹا یا نکال سکے۔ حسینؑ کے دربار میں آنے والے مہمانوں کو کیسے نکالا جا سکتا ہے؟ مجلس کے بعد گھر کی عورتوں کو "تبرک" تقسیم کرنے میں گھنٹے لگ جاتے ہیں، باہیں ٹوٹنے لگتی ہیں، مونڈھے دُکھ جاتے ہیں مگر انہیں بُرا نہیں لگتا بلکہ روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن میرے ہاں کے محرم میں نمائش اور ظاہرداری کم اور خلوص و عقیدت زیادہ تھی۔ شاید بڑے شہر والوں کو اس سادگی میں کشش نہ ہو۔ لیکن اس کا لطف میرے ہاں والوں سے پوچھئے!!

آج محرم کی دس تاریخ ہے۔ صبح پانچ بجے کا وقت ہے۔ سردی بلا کی پڑ رہی ہے۔ لیکن شہر کے ہر حصے سے لوگ جلدی جلدی محلے انصار کے اس چھوٹے سے مکان

کی طرف کھنچے چلے آرہے ہیں جس سے تعزیہ نکلتا ہے۔ مدت سے اس گھر سے تعزیہ اٹھتا آیا تھا۔ جب اُس گھر کے مالک شہر کے رئیسوں میں شمار ہوتے تھے...... آج یہ لوگ غریب ہیں، دوسروں کے محتاج ہیں۔ لیکن خاندانی روایات اور وضع داری کا تقاضا ہے کہ تعزیہ اُسی شان سے اُٹھے۔ اور شہر کے کسی بڑے سے بڑے رئیس کی یہ مجال نہیں کہ ان غریبوں سے اس حق کو چھین لے۔ تعزیہ کے اس جلوس میں ہزاروں ماتم دار مسلمان ہیں اور سینکڑوں ہندو جو جلوس دیکھنے آئے ہیں۔ چھتیں عورتوں سے پٹی پڑی ہیں۔ جن میں برقعہ پوش مسلمان عورتیں بھی ہیں اور ہندو عورتیں بھی جو لہنگے پہنے سفید چادروں سے اپنا جسم چھپائے اس زبردست اور پراثر جلوس کو دیکھ رہی ہیں۔ لو...... جلوس ٹھیر گیا، ماتم بند کر دیا گیا...... ماتم دار اُسی طرح ننگے سر ننگے پاؤں، گریبان کھلے، سڑک اور گلی میں بیٹھ گئے۔ تماشائی چپ چاپ کھڑے ہیں۔ اب کیا ہوگا؟ وہ دیکھو۔ ایک وجیہ صورت بوڑھا اٹھتا ہے اور چبوترے پر کھڑا ہو جاتا ہے اس کا چہرہ نورانی، ڈاڑھی سفید اور آواز بلند ہے۔ وہ بولنا شروع کرتا ہے۔ اور صاف بلند اور مضبوط آواز میں حسینؑ کی بے مثل قربانی کا مقصد بیان کرنا شروع کرتا ہے اور سارا مجمع ہمہ تن گوش سنتا ہے اور جذبات آنسو بن کر چہرے پر رواں ہو جاتے ہیں۔ یہ مولوی غلام الحسنین ہے۔ جس نے اسلام کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ لیکن تعصب اور تنگ نظری اس سے کوسوں دور ہیں۔ مولوی ہوتے ہوئے بہت سے ہندوؤں سے اس کے دوستانہ تعلقات ہیں۔ اس نے اپنے مدرسہ میں سینکڑوں ہندوؤں کو پڑھایا ہے جو اب بھی اس سے ملتے ہیں تو اس کے چرن چھو کر اپنی سعادت مندی کا اظہار کرتے ہیں۔

اور یہ ہے میرے ہاں کا دسہرہ۔

دس دن سے ہندوؤں میں اس تہوار کا جشن منایا جا رہا ہے۔ گھروں میں سفیدی ہوئی ہے۔ بچوں کے لئے نئے کپڑے بنے ہیں، نئے جوتے آئے ہیں۔ عورتوں کے لئے نئی ساڑھیاں خریدی گئی ہیں۔ ریشمی لہنگے بنے ہیں۔ مٹھائیاں اور پکوان بازار سے آتے ہیں، گھر میں بنتے ہیں اور ہنسی خوشی کھائے جاتے ہیں۔

وہ دیکھو! بڑے بازار میں سے دسہرے کا جلوس گزر رہا ہے۔ باجے بجتے ہوئے بنے سجے ہنستے کھیلتے لوگ ساتھ ہیں۔ ایک خوبصورت رنگین اور سجی ہوئی گاڑی پر رام چندر جی، سیتا جی اور لچھمن جی کی مورتیاں (یا ان کا بھیس بھرے زندہ آدمی) بڑی شان کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اور ہزاروں عورتیں سر سے پاؤں تک ریشمی کپڑوں سے آراستہ، زیوروں سے لدی، چھم چھم کرتی ہوئی، مرد ہنستے خوش ہوتے، بچے اچھلتے کودتے جلوس کے ساتھ ہیں۔ بہت سے مسلمان تماشائی جلوس کے دونوں طرف ساتھ ساتھ چل رہے ہیں اور اپنے ہندو بھائیوں کی خوشی میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ کل کو بھرت ملاپ ہے اور گھر گھر اس کا جشن منایا جائے گا۔

اب ذرا پنکھے کا تہوار بھی دیکھ لیجئے۔ یہ سقّوں کا تہوار ہے۔ غریب کا، پیشہ ور لوگوں کا۔ ایک بڑے سے پنکھے کو سجا بنا کر، پھولوں، پنّیوں سے آراستہ کر کے شہر سے تین میل پر "امام صاحب کے مزار" پر چڑھانے لے جاتے ہیں۔ اظہار عقیدت اور جشن منانے کا کیا اچھا طریقہ ہے! یہ ہیک کرشمہ دو کار! مجمع کے بیچ میں بہت سے نوجوان اور بوڑھے سقّے اپنے اپنے لکڑی چلانے اور پٹہ بازی وغیرہ کے کرتب دکھا

رہے ہیں۔ جلوس کے چاروں طرف ہندو مسلمان، امیر غریب سب جمع ہیں اور تماشا دیکھ رہے ہیں۔ آخر انھیں چیزوں سے تو جماعت کی رنگینت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

یہ دیکھئے...... ایک لڑکی کی شادی ہو رہی ہے۔ کسی امیر، رئیس، یا زمیندار یا عہدے دار کی لڑکی کی نہیں، بلکہ ایک غریب بیوہ کی لڑکی کی۔ اس کا گھر چھوٹا ضرور ہے مگر۔ یہ ہے اس کا اپنا! صاف ستھرا گھر۔ جس کی ہر چیز سے صفائی اور سلیقہ ٹپک رہا ہے۔

ہاں تو اس بیوہ کے ہاں شادی ہے۔ اس کی گزر بسر چرخہ کات کر اسلائی سی کر، گر بند بُن کر ہوتی ہے۔ کئی کئی دن روکھی روٹی کے سوا گھر میں کچھ نہیں پکتا۔ بلکہ کسی کسی دن چولھا جلتا ہی نہیں۔ مگر کیا مجال کہ وہ کسی کے سامنے دستِ سوال پھیلائے۔ ہاں بعض واقفِ حال ہمدرد ایسے ہیں جو خاموشی سے اس غیرت دار عورت کی مدد کرتے ہیں۔ لیکن اگر یہ لوگ اُس سے ذرا سا رعونت یا حقارت کا برتاؤ کریں تو یہ ہٹیلی عورت ان کو دروازے پر قدم نہ رکھنے دے گی۔ مدد لینا تو بڑی بات ہے۔ سلیقہ ایسا ہے کہ کسی کے پرانے کپڑے بھی پہنتی ہے تو رنگ بندھ کر اور اس خوبی سے مرمت کر کے کہ خود دینے والا بھی نہ پہچان سکے۔

اور اس بیوہ کی بچی کا جہیز بھی دیکھا؟ کسی دوسرے شہر میں اچھے کھاتے پیتے لوگ بھی اس شان کا جہیز نہیں دے سکتے۔ بیسیوں جوڑے ہیں جن کا کام اور کشیدہ دیکھنے کے قابل ہے، ہر قسم کا گھرداری کا سامان ہے، چینی تانبے کے برتن ہیں، پلنگ ہے

لبستر ہے، پیڑھی ہے، تخت ہے یہ ہے وہ ہے...... اور سونے چاندی کا زیور بھی ہے۔

آپ حیران ہوں گے کہ ایک غریب بیوہ کس طرح اتنا بہت سا جہیز اپنی بچی کو دے سکتی ہے۔ مگر آپ جانتے نہیں میرے ہاں کی عورتوں کو! اس بیوہ نے اپنا پیٹ کاٹ کر، سوکھی روٹی کھا کر، پھٹا پرانا پہن کر، سردی اور گرمی کی تکلیف اٹھا کر اپنے نفس کو مار کر، ہمیشہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ اپنی بچی کے جہیز کے لئے بچایا اور جس وقت جو چیز اچھی اور سستی ملی اُسے لے کر سی پر دکر رکھ دیا۔ اور اس طرح دس بارہ سال کی محنت سے اس نے اس جہیز کا بہت بڑا حصہ فراہم کیا ہے۔ مگر اس کے علاوہ اس جہیز کو مکمل کرنے میں دو ہاتھ اور بھی ہیں...... وہ دیکھیئے دو بوڑھی عورتیں۔ اُن میں ایک وہ...... جو سفید کپڑے پہنے بیویوں کو لڑکی کا جہیز دکھا رہی ہے سال بھر ہوا اس کی جوان نئی بیاہی لڑکی اللہ کو پیاری ہوگئی ہے۔ اس نے اپنی بچی کا سارا کپڑا اور زیور الگ رکھ دیا ہے اور پڑوس اور کنبے میں جس نادار غریب لڑکی کا بیاہ ہونے لگتا ہے یہ چپکے سے جوڑے اور دوسری چیزیں وہاں بھیج دیتی ہے۔ اور وہ دوسری بوڑھی سفید پوشش نورانی صورت کی خاتون، ہاتھ میں تسبیح لیئے، دلہن کے پاس بیٹھی اس کی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیر رہی ہے۔ اس کی جوان اکلوتی کنواری لڑکی ابھی دو مہینے ہوئے چل بسی۔ اس کے دل کا درد اُس کی صورت سے نمایاں ہے۔ آنکھیں غمگین، چہرہ اداس، لیکن وہ بڑے صبر اور حوصلے سے اس تقریب میں حصہ لے رہی ہے۔ اب ہر لڑکی اس کی بچی ہے، اُسی نے چپکے چپکے کپڑا، زیور، برتن، دو کھانے کے جوڑے اور ہر قسم کی وہ چیزیں جن کی جہیز میں کمی تھی اپنی نامراد بیٹی کے جہیز میں سے بیوہ کے گھر

پہنچائی ہیں، اور کسی کو خبر بھی نہیں کہ یہ سب سامان کس طرح مہیا ہوا۔ ساری رسموں میں سب کی سب امیر اور غریب، عزیز اور پڑوسی عورتیں اس انہماک اور اپنایت کے ساتھ شریک ہو رہی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بچی سب کی بچی ہے۔ اس کی ماں کی عزت سب کی عزت ہے۔ یہ خاندان کی، برادری کی، بستی کی عزت کا سوال ہے۔ اس میں کسی کی کیا تفریق؟

اور یہ مجمع اور چہل پہل جس کے لئے دور دور کے قصبوں اور گاؤں کے لوگ آئے ہیں، یہ دوکانوں کی رونق، یہ طرح طرح کے کھیل جو آپ دیکھ رہے ہیں، جانتے ہیں یہ کیا ہے؟ یہ ہے "قلندر صاحب کا عرس" قلندر صاحب کی یہ شاندار اور خوبصورت درگاہ، بمبئی کے چند رئیس سیٹھوں نے تعمیر کرائی تھی۔ یہ کسوٹی کے ستون جو اپنی طرز کے بے نظیر ہیں ایک لکھ پتی سیٹھ نے اپنی مراد بر آنے کی خوشی میں بنوائے تھے اس درگاہ کی آمدنی سے اپاہج، معذور، باولے اور مجذوب پلتے ہیں۔ یہ لوگ دن رات اسی درگاہ میں پڑے رہتے ہیں۔ ان میں اکثر کے ہوش و حواس سلامت نہیں لیکن پیٹ کی روٹی تو انھیں بھی چاہئے نا؟ اور اس مجذوب فقیر کی درگاہ سے ان اپاہجوں کو روٹی ملتی ہے اور اُس کی برکت سے لوگ اِن کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اس عرس میں بھی ہندو مسلمان دونوں شریک ہیں۔ دونوں کو قلندر صاحب سے عقیدت ہے۔ دونوں اس سے مرادیں مانگتے...... اور شاید...... پاتے ہیں۔

یہ قوالی ہو رہی ہے۔ قلندر صاحب کی درگاہ کے وسیع صحن، دالانوں اور چبوترے پر ہزاروں مردوں کا مجمع اکٹھا ہے۔ قوالوں کی پارٹیاں قوالی گا رہی ہیں اور

کتنے ہی لوگوں کو "حال" آرہا ہے۔ جانے سچا "حال" یا جھوٹا "حال" پر آرہا ہے ضرور۔ چھتوں پر سینکڑوں پردے دار اور بے پردہ، امیر اور غریب عورتیں جمع ہیں۔ سب کی سب چھتوں پہ سے آدھی آدھی لٹکی اس جشن کو دیکھ رہی ہیں اور مجمع کے نوجوانوں کی نظریں اس طرف سے ہٹنے کا نام نہیں لیتیں۔

میرے ہاں کے یہ ہزاروں آدمی، یہ سب ہندو اور مسلمان جوش میں بھرے، جوق در جوق کہاں جا رہے ہیں؟ ایک سیاسی جلسہ ہے! جس میں "بی اماں" (مولانا محمد علی کی ماں) تقریر کریں گی۔ یہ سنہ ۱۹۲۰ء ہے۔ سارے ملک میں آزادی کی جنگ لڑی جا رہی ہے۔ کانگریس اور خلافت، ہندو اور مسلمان یک دل ہو کر غیر ملکی حکومت سے ایک انوکھی قسم کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ اہنسا اور ستیہ گرہ کی لڑائی۔ بدیشی چیزوں کا بائیکاٹ کیا جا رہا ہے۔ سیاسی جلسے کئے جا رہے ہیں جہاں پر جوش تقریریں ہوتی ہیں جن کی کاری چوٹ حاکموں اور ان کے خوشامدیوں کے دل پر پڑتی ہے۔ وہ حیران اور پریشان ہیں کہ ان سکون پسند لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ اور حکومت ان سب کو فوراً گرفتار کر لیتی ہے جو تحریک میں پیش پیش ہیں۔ لیکن آزادی کی جنگ کے سپاہی پولس کی گولیوں اور جیل کی سختیوں سے کب ڈرتے ہیں۔ چنانچہ بہت نوجوان اور بڑی عمر کے لوگ خوشی خوشی جیل جاتے ہیں۔ دیکھئے یہ سچا قوم پرست صوفی اقبال ہے جو خوف کا نام نہ جانتا تھا۔ یہ بقاء اللہ ہے، آزادی کا مجاہد۔ یہ حافظ فیاض احمد ہے۔ جس نے اپنی زندگی ایک قومی تعلیمی ادارے کے لئے وقف کر دی ہے۔ لیکن اس وقت قوم کی خاطر اس کو چھوڑ کر جیل جانے کو تیار ہے

چالیس سال کی سیاسی چالوں کی بدولت ہندو مسلمانوں میں جو اختلاف پیدا

ہو چلا تھا وہ گاندھی جی کی قیادت کی بدولت ختم ہو گیا ہے اور وہ دونوں مل جل کر ملک کی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔ ہندو "اللہ اکبر" کے نعرے اور مسلمان گاندھی جی کے جے کارے بول رہے ہیں۔

پھر ایک اور سین میرے حافظے کے سامنے آتا ہے۔ یہ کوئی خوش آئند منظر نہیں۔ کیونکہ یہ میرے ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی مخالفت کا ایک منظر ہے۔ لیکن آپ کے سامنے اس کا ذکر اس لئے کرتا ہوں کہ اس مخالفت میں بھی ایک وضع داری تھی اس حماقت میں بھی ایک شرافت کا اظہار تھا۔

ہولی کے دن ہیں۔ اُس کا جلوس نکالنے کی تیاریاں ہیں۔ اس خوشی کے موقع پر عقل کا تقاضا تو یہ ہے کہ سب اس میں شریک ہوں۔ لیکن انسان عقل سے کب کام لیتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اس بات پر اختلاف پیدا ہوتا ہے کہ جلوس کس راستے سے گذرے؟ ہندو اُسے ایک خاص راستے سے لے جانے پر اصرار کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کا کہنا ہے کہ آج سے پہلے کبھی اس راستے سے اور مسجد کے سامنے سے جلوس نہیں گیا...... آج بھی نہیں جائے گا...... جاہل عوام کو کون سمجھائے کہ محبت اور رواداری ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے کہیں زیادہ اہم چیز ہے۔ ہندو فساد کرنا نہیں چاہتے لیکن بعض مقامی حکام انہیں بھڑکا رہے ہیں کہ تم اپنی ضد پر قائم رہو۔ شاید دوسرے لوگ مسلمانوں کو شہ دے رہے ہیں۔ انھیں اس شہر کا امن اور ہندو مسلم اتحاد کیوں اچھا لگے گا، اس کی وجہ سے انھیں اپنی کارگزاری دکھانے کا موقع نہیں ملتا۔ اپنی بدیسی حکومت کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ ہر جگہ فرقہ وارانہ اختلاف اور منافرت

پیدا کی جائے۔ جب معاملہ زیادہ بڑھ جاتا ہے تو بعض پر جوش مسلمان ہندوؤں کے خلاف نہیں بلکہ حکومت کے خلاف احتجاج کی ایک نئی تدبیر سوچتے ہیں۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ پیچھے سے باندھ کر ـــــ تاکہ تشدّد کا کوئی سوال ہی نہ رہے ...... راستے میں لیٹ جاتے ہیں۔ جلوس گذرے گا تو ہمارے اوپر سے۔ یہ گاندھی جی کی اہنسا کا ایک نیا استعمال ہے۔ چاروں طرف ہزاروں تماشائی کھڑے ہیں، خاموش، پرامن، بے ضرر، اس ڈرامے کا انجام دیکھنے کے مشتاق۔

اور پھر یک لخت پولس آجاتی ہے، جو زبردستی نوجوانوں کو ہٹانے کی کوشش کرتی ہے، لاٹھی چلاتی ہے۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ اتنے میں کسی چھت پر سے ایک کم سن لڑکا پولس پر ایک پتھر پھینک دیتا ہے ...... پتھر کیا تھا ایٹم بم تھا! خداوندانِ حکومت کی شان میں یہ ہتک! کیسے برداشت ہو سکتا ہے یہ؟ گولی چلا دینے کا حکم دیا جاتا ہے۔ ان نوجوانوں پر جو ہاتھ پشت پر باندھے زمین پر پڑے ہیں ...... ان بے خبر شہریوں پر جو محض تماشا دیکھنے جمع ہو گئے تھے۔ ان کمزور دل لوگوں پر جو گولی کی آواز پر بھاگنا شروع ہو گئے تھے۔ اور ان بچوں پر جو اپنے گھروں کی کھڑکیوں سے جھانک رہے تھے   قلندر صاحب کی درگاہ، نقار خانے، اور چوک کی دیواروں پر گولیوں کے نشان آج بھی آپ دیکھ سکتے ہیں اور آٹھ شہید   جو اس روز پولس کے ظلم کا شکار ہوئے، امیری گود میں سوتے ہیں۔ پانی پت کے ہندو اور مسلمان دونوں ان کو عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کے احتجاج میں ظلم و تشدد نہ تھا!

آپ میری داستان سے اُکتا تو نہیں گئے؟ اچھا تو پھر ایک اور منظر دیکھ لیجئے۔ اس کے بعد تاریخ کا ایک نیا اور تاریک دور شروع ہو جائے گا۔

یہ حالی مسلم ہائی سکول ہے۔ حالی کی تعلیمی یادگار۔ اس کے چاروں طرف خیموں کا یہ جنگل کہاں سے اُگ آیا؟ شہر کے باہر دس ہزار کی آبادی کا ایک نیا شہر ایک دم کیسے آباد ہو گیا؟ یہ چہل پہل کیسی ہے؟ یہ راجہ نواب، شاعر اور ادیب، عوام اور خواص کیوں اس جگہ جمع ہیں؟

اس جلسے کی صدارت نواب صاحب بھوپال کر رہے ہیں۔ ان کے داہنی طرف ہندوستان کے مایۂ ناز شاعر ڈاکٹر اقبال بیٹھے ہیں۔ سامنے کی صف میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور بہت سے دوسرے مشاہیر ہیں۔ پلیٹ فارم پر حفیظ جالندھری اپنے مخصوص انداز میں باآواز بلند ایک نظم پڑھ رہے ہیں۔ نظم میری شان میں ہے اس لئے اس کے چند شعر آپ کو بھی سنا دوں......

نشانِ زندگی پاتا ہوں پانی پت کی راہوں میں
یہ منزل منزلِ مقصود ہے میری نگاہوں میں
یہاں نقشِ قدم موجود ہیں ان کاروانوں کے
زمیں پر جن کے آگے سر جھکے تھے آسمانوں کے
اسی باعث ملا اس سرزمیں کو رتبۂ عالی
کہ اس بستی کی خاکِ پاک سے پیدا ہوا حالی
وہ حالی! جس نے ابدالی سے بڑھ کر معرکہ مارا
تکلم سے مسخر کر لیا ہندوستاں سارا

وہ حالی! ہاں وہی سرسید مرحوم کا بازو
وہ امت کی سپر وہ ملت مرحوم کا بازو
دلوں کو درد حب قوم سے آگاہ فرما کے
وہ حالی! آج محو خواب ہے اس خاک کے نیچے

ڈاکٹر اقبال بھی حالی کی بارگاہ میں چند اشعار پیش کرنے لائے ہیں۔ ان کی اپنی آواز جواب دے چکی ہے۔ اس لئے ایک اور صاحب ان کے شعر پڑھ کر سناتے ہیں

مزاج ناقہ را مانند عرفی نیک می دانم
چوں محمل را گراں بینی حدی را تیز تر خوانم

اور چند شعر کے بعد صدر جلسہ کو مخاطب کیا۔

طواف مرقد حالی سزد ارباب معنی را
نوائے او بجاں ہا افگند شورے کہ من دانم
بیا تا فقر و شاہی در حضور او بہم سازیم
تو بر خاکش گہر افشاں و من برگ گل افشانم

پھر ایک ضعیف انسان، جس کے چہرے پر شرافت اور انسانیت کی شان جلوہ گر ہے، اپنی لکڑی کے سہارے تقریر کرنے کھڑا ہوتا ہے۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی ہے اور ہاتھوں میں رعشہ ہے۔ یہ حالی کا بیٹا سجاد حسین ہے۔ جو ان تمام مہمانوں کا خیر مقدم کرنے کو کھڑا ہوا ہے جو حالی کے وطن میں اس کی صد سالہ جوبلی منانے اور اس کی علمی ادبی خدمات کا اعتراف کرنے کے لئے ملک کے کونے کونے سے کھیچ کر آئے ہیں۔ ان میں ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی سبھی شامل ہیں۔ سب کو حالی جیسے

شاعر اور انسان کا ہم وطن ہونے پر فخر ہے اور مجھے یہ فخر ہے کہ میری مردم خیز مٹی سے حالی جیسا شخص پیدا ہو........ اس روز میرا سر جس قدر بلند تھا، اور میرے دل میں جس قدر خوشی تھی ایسی مدت سے نصیب نہیں ہوئی تھی اور اب تو اس کا امکان ہی نہیں رہا کہ نصیب ہو۔

دس سال گزرے کہ ہندوستان کی سیاست کا نقشہ تیزی کے ساتھ بدلنا شروع ہوا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے صدیوں کی مروت اور محبت کو بھلا کر، ناعاقبت اندیش لیڈروں کا فریب کھا کر ایک دوسرے سے مغائرت شروع کر دی۔ جو رفتہ رفتہ اختلاف، تعصب اور نفرت میں بدلتی گئی۔ یہاں تک کہ بھائیوں بھائیوں میں قتل وخون کی نوبت آ گئی! جب یہ زہر ہر طرف پھیلنا شروع ہو، پورب، پچھم، اتر، دکھن، تو میں اس سے بالکل محفوظ کیوں کر رہ سکتا تھا۔ میری اولاد میں بھی سیاسی اختلافات پیدا ہونے شروع ہوئے۔ میرے ہاں کے بہت سے مسلمان، بعض غالباً سمجھ بوجھ کر، لیکن زیادہ تر بے سمجھے بوجھے، محض لیڈروں کی سنسنی اور بھیڑ چال کی بدولت لیگ میں شامل ہو کر پاکستان کا مطالبہ کرنے لگے۔ اور اس کے ردِعمل کے طور پر ہندو بہت سختی کے ساتھ اکھنڈ ہندوستان کے حامی اور کانگریس اور مہاسبھا میں بٹے ہوئے تھے۔ مسلمانوں میں روز بروز لیگ کا اثر بڑھنے لگا اور شہر کے بیشتر مسلمان پاکستان کا خواب دیکھنے لگے تھے۔ وہ واقعی خواب ہی تھا! کیونکہ وہ کچھ نہ جانتے تھے کہ یہ پاکستان کیسے بنے گا؟ اس کا اثر ملک پر کیا پڑے گا؟ اس سے مسلمانوں کو حقیقت میں فائدہ ہوگا یا نقصان؟ مگر ان میں ایک جماعت قوم پرستوں کی بھی تھی جو سچے دل سے ہندو

اور مسلمانوں کا اتحاد اور ہندوستان کی ایکتا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا اثر کمزور پڑ چکا تھا اور عام ہندو اور مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن ایک عجیب بات یہ تھی کہ اس کے باوجود یہ اختلاف زیادہ تر سطحی تھا۔ مسلمان لیگی اور پاکستانی تھے، ہندو کانگریسی یا مہا سبھائی۔ لیکن اب بھی ان کے باہمی تعلقات پر، ان کے روزمرہ کے کاروبار پر، ان کے دلوں پر اس کا کوئی گہرا اثر نہ تھا۔ وہ اب بھی ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے۔ ذاتی مراسم اور دوستیاں قائم تھیں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے پہلے سے کم ضرور تھے لیکن انسانیت کے سوتے خشک نہیں ہوئے تھے۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ افراتفری کے ان سالوں میں پانی پت کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کبھی کوئی قابلِ ذکر جھگڑا یا مارپیٹ یا قتل و خون نہیں ہوا۔ ملک کے دوسرے حصوں میں طوفان کی اونچی اونچی لہریں اٹھتی تھیں، جن کا اثر میرے ساحل تک پہنچتا تھا۔ لیکن زندگی کا عام مرقع ان کی وجہ سے درہم برہم نہیں ہوا ـــــــ اس وقت تک جبکہ ملک کو آزادی ملی اور بہت سی نئی زنجیریں گردن میں پڑ گئیں!!

پھر میں نے سنا کہ ہندوستان کو آزادی ملنے والی ہے ـــــــ سنا کہ پاکستان بننے والا ہے، سنا کہ پنجاب بٹ جائے گا ـــــــ مغربی پنجاب پاکستان میں شامل ہوگا اور مشرقی پنجاب ہندوستان میں۔ پاکستان کی خبر سن کر مسلمان خوش ہوئے تھے۔ ہندو ناراض تھے۔ پنجاب کی تقسیم سے میرے ہندو اور قوم پرست مسلمان خوش ہوئے کہ ان کا وطن ہندوستان کا جزو رہے گا اور باقی مسلمان پریشان تھے کہ ان پر تقسیم کے بعد کیا بیتے گی۔

اور آخر ـــــــ ہندوستان آزاد ہو گیا ـــــــ پنجاب بٹ گیا!

سرحدوں کا اعلان ہوا۔ شمالی پنجاب میں جو فساد ہو رہا تھا اس نے باقاعدہ سول جنگ کی صورت اختیار کر لی اور ہندو مسلمان سکھ سب پاگل ہو کر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ ہر طرف شرافت کا بازار مندا پڑ گیا اور ظلم کا بازار گرم ہوا۔ اس کی وجہ ایسی بھگدڑ مچی کہ الامان۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے علاقوں سے اس طرح بھاگنے شروع ہوئے جس طرح وحشی درندوں کے خوف سے۔ میرے ہاں کے مسلمان حاکم بھاگ بھاگ کر یا تبادلۂ حکام کے سلسلے میں پاکستان چلے گئے۔ اور مغربی پنجاب کے ہندو سکھ حاکم اور افسر میرے ہاں بدل کر آئے .... ان میں بہت سے لوگ زخم خوردہ تھے مغربی پنجاب میں وہ خود یا ان کے عزیز یا دوست ظلم کا شکار ہوئے تھے یا ان کی دکانیں اور ان کے گھر اُن سے چھن گئے تھے۔ ان کے دلوں میں ہر مسلمان کے خلاف غم و غصہ کا طوفان جوش کھا رہا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ جو کچھ اُن کے ہم مذہبوں پر گذری ہے وہ سب بلکہ اس سے بھی زیادہ مسلمانوں پر گزرے۔ اس سے کسی کو کیا مطلب تھا کہ یہ ہندو یا یہ مسلمان گنہ گار ہیں یا بے گناہ۔ محض ہندو یا مسلمان ہونا ان اندھے مسلمانوں اور ہندوؤں کے نزدیک سب سے بڑا گناہ تھا۔

میرے ہاں کے لوگ حد درجہ پریشان اور بدحواس تھے۔ ہندو ڈر رہے تھے کہ مسلمان اکثریت میں ہیں۔ جانے کس دن اُٹھ کھڑے ہوں اور ہمیں پیس ڈالیں۔ مسلمان خوف زدہ تھے کہ سارے افسر مغربی پنجاب سے آئے ہوئے ہیں اور انہیں اندیشہ تھا کہ مشرقی پنجاب کی حکومت یا مقامی حکام، کسی نہ کسی طرح میاں کے ایک ایک مسلمان کو نکال دینا چاہتی ہے۔ لیکن وہ کسی طرح اپنا شہر چھوڑ کر جانے کو تیار نہ تھے۔ وہ تکلیفیں سہیں گے، مشکلیں اٹھائیں گے۔ مگر اپنا گھر بار نہ چھوڑیں گے ...... وہ ہزار برس سے

یہاں رہتے آئے ہیں۔ اس شہر کی اینٹ اینٹ ان کو پیاری ہے۔ یہاں ان کے بزرگوں کی یادگاریں ہیں، یہاں ان کے باپ دادا کی ہڈیاں دفن ہیں، یہاں ان کی مسجدیں اور مزار اور امام باڑے ہیں...... انھیں وہ کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ ان کے گھر ہیں جن میں ان کی کئی کئی نسلوں نے زندگی بسر کی ہے...... جن کو چھوڑ کر وہ قصر جنت کی آرزو بھی نہ کرتے تھے۔ یہ قناعت شعار قدامت پسند، روایات پرست لوگ کچھ ہو۔ کسی قیمت اپنے شہر کو چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے...... پاکستان مل گیا —— اچھا ہوا وہاں کے مسلمان آرام سے رہیں —— وہ یہاں مصیبت و تکلیف ہی اٹھالیں گے مگر پانی پت کو نہ چھوڑیں گے۔ یہ لوگ امید پالتے رہے...... خود مجھے بھی اندازہ نہ تھا کہ اب ہزار برس کی رفاقت کے ختم ہونے کا زمانہ آگیا ہے۔

ستمبر کے شروع میں خبر ملی کہ دلی میں قیامت آگئی ہے۔ غدر مچ گیا ہے۔ لوگ مذہبی (یا لا مذہبی؟) جنون میں گرفتار ہو کر دوسرے مذہب والوں کو چن چن کر لوٹ رہے ہیں، قتل کر رہے ہیں۔ میرے بھی بہت سے خاندان وہاں تھے۔ کچھ خبر نہ تھی کہ ان پر کیا بیتی۔ ہر طرح کی افواہیں گرم تھیں۔ لیکن دلی کی مصدقہ خبریں معلوم نہ ہوتی تھیں۔ ریلیں بند تھیں، ڈاک بند تھی، تار بند تھے، اخبار بند تھے۔ صرف ایک ریڈیو تھا جس کے ذریعے کچھ جھوٹی سچی خبریں سنی جاسکتی تھیں۔

میرے ہاں کرفیو لگا دیا گیا تھا۔ یہ ایک ایسا لفظ تھا جو مجھے یاد نہیں کہ میں نے اس سے پہلے سنا ہو۔ پولیس کی ہر طرف حکومت تھی جو چاہتے کرتے۔ بہت سے لوگوں کو محض کرفیو کا مفہوم نہ جاننے کی وجہ سے حوالات کا منہ دیکھنا پڑا۔ بعض غریبوں، بے

گناہوں کی اس کی وجہ سے جان ہی گئی۔ یہ کرفیو عذاب جان ہو گیا تھا۔ صبح سے شام تک، شام سے صبح تک گھر میں بند رہو۔ ایک دو گھنٹے کے لئے کھلتا تو دو کانوں کی طرف لوگ جھپٹتے، لیکن اس تھوڑے سے عرصے میں سب کی حاجت براری کیسے ہو سکتی تھی؟ نادار بیوائیں، بوڑھے، بیمار جن کے گھر میں کوئی اور مددگار نہ تھا دوکانوں تک پہنچ بھی نہ پاتے تھے یا پہنچ جاتے تو ان کی باری نہ آتی تھی کہ یہ ظالم کرفیو پھر نافذ ہو جاتا۔ ان دنوں میں لوگوں کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ دیکھی نہ جاتی تھی کتنے ہی آدمی گھروں میں پانی نہ ہونے کے باعث نیم جان ہو گئے، کھانا نہ ملنے کی وجہ سے گھروں میں سسکتے رہے، کتنے جانور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ لوگوں کے کاروبار بند تھے، بازار تھے، آمدنی کے ذریعے بند تھے۔ گھر میں جو تھا وہ کھا لیا اب کیا کریں؟ مسلمان شہر سے باہر مُردوں کو دفن کرنے نہ جا سکتے تھے۔ بازار سے کفن لینے نہ جا سکتے تھے۔ خط ڈالنے، یا لینے یا تار دینے ڈاک خانے نہ جا سکتے تھے۔ اس کرفیو میں فوج اور پولیس والوں کی بن آئی۔ انھوں نے اس کرفیو کی حالت میں لوگوں کے گھروں کی تلاشیاں لیں ...... زیادہ تر مسلمانوں کی۔ چند گھروں میں لوہاروں سے بنوائے ہوئے ہتھیار ضرور نکلے۔ لیکن اکثر گھروں میں ترکاری کاٹنے کی چھری یا چاقو کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیکن "احتیاطاً" یہ کند چھریاں اور ٹوٹے چاقو بلکہ نوکدار قینچیاں تک ان سے چھین لی گئیں۔ اور ساتھ ہی اس تلاشی کے بہانے لوگوں کے گھروں سے ریڈیو، گراموفون، لائسنس والے ہتھیار، زیور اور جو قیمتی چیز ملی وہ بھی یاروں نے ہتھیالی اور اس اندھیر گردی کے زمانے میں کسی کی مجال نہ تھی کہ چوں کر سکے۔ اور پھر اہل کاروں کی کیا شکایت کروں۔ ایسے وقت میں ہمیشہ سماج کے بدترین عناصر سماج پر چھا جاتے ہیں۔ چنانچہ خود غرض اور سنگ دل بیوپاریوں اور چور بازار والوں کی بن

آئی۔ انھوں نے لوگوں کی مصیبت سے فائدہ اٹھانا شروع کردیا۔ ایک سو بیس روپے تولہ کا سونا، بیس پچیس روپے تولہ خریدا۔ ایک ایک پان جس کی بوڑھی عورتیں بے طرح عادی تھیں ایک ایک روپے تک فروخت کیا۔ ہر ضرورت کی چیز دس بیس گنے داموں بیچی اور ضرورت مندوں کی چوتھائی اور آٹھویں حصے داموں خریدی! ان سماج دشمنوں کے بھاگوں تو یہ دن آیا تھا! وہ اس سے کیوں فائدہ نہ اٹھاتے؟

میرے سمجھدار لوگ برابر اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ خواہ کتنا ہی ظلم ہو، کتنی سختیاں جھیلنی پڑیں، شہر میں امن قائم رہے۔ انھیں امید تھی کہ یہ دن بیت جائیں گے، انسانوں میں عقل اور رواداری کی جوت پھر جاگے گی۔ ان کا پیارا وطن پھر ان ہی کا ہوگا۔ وہ کر بھی کیا سکتے تھے؟ کوئی افسر ان کا ہمدرد نہ تھا، فوج پولیس ان کی دشمن بنی ہوئی تھی، کوئی ہتھیار ان کے پاس نہ تھا، ان کے صاحب اثر اور سمجھدار لوگ یا شہر سے دور ایسے مقامات پر تھے جہاں انھیں خبر بھی نہ تھی کہ ان کے وطن پر کیا بیت رہی ہے۔ جو چند نوجوان شہر میں رہ گئے تھے انھیں گرفتار کرلیا گیا تھا۔ کوئی صاحب اثر دا اقتدار لیڈر ان کی رہنمائی کرنے والا نہ تھا۔ وہ محض یہی کر سکتے تھے کہ خاموشی سے سارے مظالم سہیں اور چپ چاپ نتیجے کا انتظار کریں۔

افواہوں کا بازار گرم تھا! ہر روز کوئی نئی خبر پچھلی خبروں سے زیادہ خوفناک خبر پھیلتی تھی۔ ہر قسم کی سچی جھوٹی، اصلی، مبالغہ آمیز باتیں جو چھوٹے چھوٹے مقامی حکام سے منسوب کی جاتیں آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل جاتیں: "ہم ہر مسلمان کو تین کپڑوں میں شہر سے نکالیں گے، وہ جائیں اپنے پاکستان ہمارے ہندوستان میں کیوں رہتے ہیں؟" اور میرے وطن کو چاہنے والے بوڑھے اور جوان اپنا دل پکڑ کر

رہ جاتے ۔ یا اللہ تو ہی ہمارا مددگار ہے۔

"مسلمانوں کے سب محلے پٹرول ڈال کر جلا ڈالے جائیں گے" ہر شخص کو اپنے سامنے ملک الموت کی تصویر نظر آجاتی۔

"خوبصورت اور جوان لڑکیوں کو رکھ لیں گے اور باقی سب لوگوں کو نکال دیں گے" اور میری بچیاں جن کی جان خوف وہراس سے پہلے ہی آدھی ہو چکی تھی۔ لرز لرز کر اپنے بزرگوں سے لپٹ جاتیں اور رو رو کر اپنی موت کی دعائیں مانگنے لگتیں۔

"ہم پانی پت کے مسلمانوں کو پاکستان مانگنے کا ایسا سبق دیں گے کہ وہ یاد رکھیں گے" اور وہ سوچتے! واہ اچھا پاکستان ملا۔ جس نے ہماری عافیت تنگ کردی۔ ہماری جان اور مال دونوں کو خطرے میں ڈال دیا۔

"ہم جواہر لال اور گاندھی کے بھاشنوں کو کیا سمجھتے ہیں۔ جو ہندوؤں پر مغربی پنجاب میں گذری ہے، وہ سب یہاں کے مسلمانوں کو بھگتنی ہو گی!" اور پانی پت کے لوگ سوچتے کیا واقعی جواہر لال اور گاندھی جی کچھ نہیں کر سکتے ہمارے لئے؟

لیکن پھر...... یہ خوش عقیدہ لوگ ...... اپنے کو فریب دینے میں کامیاب ہو جاتے۔ خدا نے چاہا تو کچھ نہ ہو گا...... انجام کار پانی پت محفوظ رہے گا۔ بچ جائیگا۔ اگر گاندھی جی اور جواہر نہ سن سکیں گے تو کیا خدا بھی نہ سنے گا؟ ہمارے دکھی دلوں کی پکار اپنی منزل تک پہنچ جائے گی!

اس اثنا میں مغربی پنجاب کے ہزاروں سکھ اور ہندو "شرنارتھی" شہر کے باہر چاروں طرف جمع ہو چکے تھے۔ اسٹیشن کے قریب جس قدر مسلمانوں کے مکان اور دکانیں وغیرہ تھیں ان پر "پناہ گزینوں" کا قبضہ ہو گیا تھا۔ وہاں کے کچھ لوگ تو پہلے

ہی خطرے کو سونگھ کر شہر کے اندر چلے آئے تھے۔ جو باہر رہ گئے ان کا انجام مجھے معلوم نہیں ـــــ کسی کو معلوم نہیں

ستمبر کے آخر میں آس پاس کے جتنے مسلمانوں کے گاؤں تھے انھیں ہر قسم کے غنڈوں اور "رفیوجیز" نے مل کر لوٹنا شروع کر دیا۔ نہ معلوم کتنے اس جنون کی آگ میں جل کر ختم ہو گئے، کتنے بھاگ گئے۔ ہاں مجھے اتنا معلوم ہے کہ اِدھر اُدھر کے گاؤں میں سے کئی ہزار مصیبت کے مارے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں پناہ لینے کے لئے میرے ہاں آئے۔ جو پہلے آئے وہ بہتر حالت میں تھے۔ گاؤں کے لٹنے اور جلنے سے پہلے اپنے کپڑے بستر، زیور اور روپیہ بچا کر چلے آئے تھے۔ کچھ اس طرح آئے کہ سامان گاڑیوں میں بھر کر چلے لیکن راستے میں آندھی اور بارش نے، طوفان نے یا قانون شکن غنڈوں نے انھیں گھیر لیا اور وہ سارا سامان چھوڑ کر، اپنی جان بچا کر بھاگ نکلے۔ اس افراتفری میں عورتیں گم ہو گئیں، بچے کھو گئے، خاندان تتر بتر ہو گئے اور بچے کھچے لوگ تباہ حال میرے ہاں پہنچے اور پھر آخر میں کئی ہزار انسانوں کے ایسے قافلے آئے جن کی بپتا کا بیان کرنا مشکل ہے، بوڑھے، جن کی جوان اولاد ان کے سامنے ختم کر دی گئی تھی۔ بیوہ عورتیں جن کے راج لٹ گئے تھے، بچے جن کے باپ کو ان کی معصوم آنکھوں کے سامنے بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ گود خالی مائیں جن کے لاڈلوں کو ان کے سامنے وحشت اور درندگی کی بھینٹ چڑھایا گیا تھا۔ مصیبت اور تباہی کا یہ دردناک منظر دیکھ کر میری روح تک لرز اٹھی۔ لیکن .... خدا کا شکر ہے کہ اس وقت میرے بچوں نے اپنی قدیم روایات کو تازہ کر دیا۔ غدر میں ان کے بزرگوں نے دلی، میرٹھ کے مصیبت زدوں کو پناہ دی تھی۔ اب انھوں نے مصیبت میں اپنے پڑوسیوں کی دستگیری کرنا اپنا فرض جانا

خود ان کے سر پر تلوار لٹک رہی تھی، خود ان کی جان، مال، عزت خطرے میں تھی لیکن ان لوگوں کی حالت دیکھ کر وہ یہ سب کچھ بھول گئے۔ یہ قدامت پرست خاندان کی شریف باعصمت عورتیں جن کا پلّا بھی کسی غیر مرد نے نہ دیکھا تھا، آج بدن پر چیتھڑے لگائے تھیں! محبت کی آغوش میں پلے ہوئے بچے یاس وحیرانگی اور مظلومیت کی تصویر تھے۔ یہ بوڑھے مرد اور عورتیں جنہیں اپنے گھر اور گاؤں جان سے زیادہ پیارے تھے، دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھر رہے تھے اور انھیں کوئی پناہ دینے والا نہ تھا!!! میرے سپوتوں نے اپنے گھروں اور دلوں کے دروازے ان پر کھول دئے جس سے جو بن پڑا وہ کیا۔ اپنی ضرورت کا اناج، اپنے پہننے کے کپڑے، اپنے رہنے کی کوٹھریاں ان کی نذر کر دیں لیکن ہزاروں آدمی تھے۔ کہاں تک ان کی کھپت ہوتی؟ کچھ فرض شناس نوجوان اپنی پونجی ختم کرنے کے بعد گلے میں جھولی ڈال کر اپنے مصیبت زدہ بہن بھائیوں کے لئے چندہ مانگتے پھرتے اور ان پناہ گزینوں کو کھانا پکا پکا کر کھلاتے، ہاں.... میرے ہاں بھی بعض ایسے سنگ دل موجود تھے جن کے دل میں اس وقت بھی دولت کی محبت کا جذبہ سب سے زیادہ قوی تھا...... وہ دیکھئے ایک دولت مند عہدے دار کے گھر سے ان نوجوانوں کی جھولی میں ایک سیر آٹا ڈالا گیا ہے...... ایک سیر آٹا!! وہ دوسرا شہر کے رئیس کا مکان ہے، جہاں سے ان مصیبت کے ماروں کی مدد کے لئے ایک چوّنی دی گئی ہے........ یہ دیکھئے...... اس محلے میں شہر کے وہ کاریگر رہتے ہیں جنھوں نے حال ہی میں جنگ کی برکت سے دولت پیدا کی ہے....... ان کے دل ابھی پتھر نہیں ہوئے....... یہ مفلسی کے دکھوں کو جانتے ہیں اور دوسرے کی مصیبت کا کچھ احساس کر سکتے ہیں... ... لیکن چند سال پہلے اسی شہر میں یہ "ذلیل" اور "نیچ ذات" سمجھے جاتے تھے....

آج وہ ان "شریفوں" پر اپنی اہمیت اور شان کا رعب ڈالنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم کئی سو کمبل اور ادنیٰ صدریاں مصیبت زدوں کو دیں گے۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ خود، ہر عورت ہر مرد، ہمارے دروازے پر آکر لے...... لیکن نوجوان اس شرط کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا........ یہ غیرت دار، شریف، سید آج غریب ہوکر، محتاج ہوکر ان "کمینوں" کے گھروں پر خیرات لینے آئیں؟ نہیں نہیں ہرگز نہیں...... دینے والا بے پروائی سے ان کے انکار کو سنتا ہے "بہت اچھا...... میں اور کسی کو دیدوں گا جو میری یہ شرط قبول کرے" اور میں زمانے کے انقلاب کو حیرت سے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا ہوں!!

یہ امام باڑہ ہے...... یہاں ہر سال امام حسینؑ کی مجلس عزا برپا ہوتی ہے...... آج اس میں کئی سو مصیبت زدہ گاؤں والے پڑے ہیں...... جن کو کسی نہ کسی طرح محلے والے کھلاتے ہیں۔ یہ حالی کا گھر ہے........ آج اس گھر میں بہت سی مصیبت ماری خانماں برباد عورتوں نے پناہ لی ہے۔ وہ دیکھئے ایک نوجوان عورت درد سے تڑپ رہی ہے، سردی سے کانپ رہی ہے، اس کے بدن پر پھٹے کرتے اور زدہ پاجامے کے سوا اور کچھ نہیں...... ایک چادر بھی نہیں جس سے وہ اپنے کو ڈھانک سکے۔ آس پاس جتنی عورتیں ہیں خود اسی حالت بے لبی میں ہیں اور آنکھوں میں آنسو بھرے اس کی حالت دیکھ رہی ہیں اور کچھ نہیں کرسکتیں۔

تڑپتے تڑپتے، چیختے چیختے ایک دم وہ چپ ہوجاتی ہے، شاید بے ہوش ہوگئی ہے اور اس کے بجائے ایک نوزائیدہ بچے کی آواز فضا میں گونجنے لگتی ہے یہ ایک بدنصیب محتاج بیوہ ماں ہے۔ جس کا چہیتا نوجوان شوہر پرسوں مارا جاچکا ہے،

......ہاں یہ ایک ماں ہے اور یہ اُس کا پہلا بچہ!! پڑوسی عورتیں اس کی حالت سُن کر تڑپ اٹھتی ہیں اور اپنے گھروں سے ہر ضروری چیز نکال نکال کر بھیجتی ہیں۔ وہ بھی عورتیں ہیں، شوہر والی، بچوں والی ——— جانے ان پر خود کیا بپتا پڑنے والی ہے؟ ان کے دل آج ہمیشہ سے زیادہ نرم اور حساس ہو گئے ہیں۔

اور پھر....... حاکموں کے حکم سے...... ان حاکموں کے حکم سے جنھوں نے کبھی یہ نہیں سنا تھا کہ حکومت خدمت کا شرف بخشتی ہے، یہ ہزار سے زیادہ مصیبت کے مارے مرد، عورت، بچے سب بھیڑ بکریوں کی طرح شہر سے باہر ایک عمارت میں بھر دئے جاتے ہیں! آپ پہچانتے ہیں یہ کون سی عمارت ہے؟ یہ "حالی مسلم اسکول" کی عمارت ہے۔ جہاں آپ نے "حالی جوبلی" کا شاندار جشن دیکھا تھا۔ آج ایک دوسرا "جشن" دیکھئے۔ اس عمارت میں سینکڑوں بھوکے پیاسے لوگ پڑے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف سیلاب کا پانی جمع ہے، اس کا کنواں گندہ ہو چکا ہے، کھانے پینے کا کوئی انتظام نہیں...... ہیضے کے کئی کیس ہو چکے ہیں، کوئی ڈاکٹر نہیں، دوا علاج نہیں، کوئی پرسان حال نہیں، چاروں طرف لاشیں پڑی ہیں، جن کے کفنانے دفنانے کا انتظام نہیں۔ لوگ اپنے پیاروں، اپنے چہیتوں کو اُس بے حسی کے ساتھ جو انتہائی نراس کا نتیجہ ہوتی ہے ان ہی کپڑوں میں باہر ڈال دیتے ہیں...... مصیبتوں کی بوچھاڑ نے ان کے حواس مفلوج کر دئے ہیں، دل بے حس، آنکھیں پتھر...

یہ روح فرسا منظر دیکھ کر میرا دل درد سے پھٹا جاتا ہے، سر شرم سے جھکا ہوا ہے...... میرے مہمانوں کی یہ حالت....... اور میں...... میں کچھ نہیں کرسکتا!

اکتوبر شروع ہو گیا........ یہ ہر بری چیز کے بڑھنے کا زمانہ ہے شہر میں پریشانیاں اور یاس بڑھ رہی ہے، پولس اور فوج کی سختیاں بڑھ رہی ہیں ..... شہر کے باہر مغربی پنجاب کے رفیوجیز کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ جن کے کھانے پینے رہنے سہنے دوا علاج کا کوئی انتظام نہیں ـــــ ان کا غصہ بڑھ رہا ہے .... وحشت بڑھ رہی ہے۔

کبھی کبھی ریڈیو پر، ہندوستان اور پاکستان سے، پانی پت والوں کے نام، ان کے عزیز پیام نشر کرتے ہیں کہ وہ گھبرائیں نہیں ہم ان کو پانی پت سے بلانے کے انتظام میں لگے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کی خوش نصیبی پر لوگ رشک کرتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ وہ باہر جا کر اپنے وطن کو بچانے اور ہم وطنوں کی مصیبت دور کرانے کی کوشش کریں۔ لیکن جو رہ گئے اور جو باہر جا سکے سب پر ایسی بپتائیں گذریں جن کو نہ وہ بھول سکیں گے نہ میں۔ ایک خاندان کی جلا وطنی کا حال سن لیجئے۔ جس سے آپ کو کچھ اندازہ ہو جائے گا۔ اتنا بتا دوں کہ یہ میرا ایک معزز خاندان تھا جس کی شہر کے تمام ہندو اور مسلمان دل سے قدر کرتے تھے، جو ہمیشہ سے وطن پرست رہا تھا، جس کی تھوڑی بہت پوچھ حکومت میں بھی تھی۔ ان کے ساتھ جو سلوک ہوا اُس سے ؎

قیاس کُن زگلستانِ من بہار مرا

اس گھر کے مرد، جو خدا کو پیارے نہیں ہو چکے، ملک کے مختلف حصوں میں اپنے اپنے کاروبار میں مصروف ہیں اور گھر میں صرف چند چھوٹے چھوٹے بچے تین جوان عورتیں اور دو بوڑھیاں ہیں۔ جو خاموش واداس بیٹھی یہ سوچ رہی ہیں کہ اس بے بسی

کے وقت میں کس سے سہارا مانگے...... کس سے مدد طلب کریں... یہ عورتیں جو برسوں سے بغیر کسی مرد کے یہاں اطمینان سے رہتی آئی ہیں! اب دو ہفتے سے دہشت اور پریشانی، خوف و اضطراب نے انھیں آدھ موا کر دیا ہے۔ ان کے مرد باہر ہیں اور وہ ان کے اور یہ اُن کے حال سے بے خبر!

رات کے آٹھ بجے ایک افسران کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور اطلاع دیتا ہے کہ کل صبح کرنال سے ان کے لئے فوجی ٹرک آئے گی جس میں انھیں دلی لے جایا جائے گا۔ پرائم منسٹر کے حکم سے یہ انتظام کیا گیا ہے اور وہ اپنا سب کچھ سامان اپنے ساتھ لے جا سکتی تھیں۔ لیکن مقامی خداوندوں کا حکم ملتا ہے کہ تم لوگ گھنٹہ بھر کے اندر اندر تیار ہو کر کوتوالی چلو اور سامان صرف اتنا لے سکتی ہو جو اپنے سر پر اٹھا کر لے جا سکو!!

سب سکتے میں رہ جاتے ہیں! یہ کیسے ہوگا؟ یہ بوڑھی، کمزور اور مریض عورتیں کیسے سامان اٹھا کر چلیں گی؟ مائیں ان ننھے ننھے بچوں کو کیسے اٹھائیں گی؟ جن لوگوں نے بغیر سواری کے قدم باہر نکالا ہو وہ کوتوالی تک پیدل کیسے جائیں گی؟ بہت مشکل سے رات بھر کی مہلت اور تانگوں پر آنے کی اجازت دی جاتی ہے۔

بوڑھی اور جوان عورتیں ملنے والوں کی مدد سے اپنا ضروری تریں سامان ایک دو بکسوں میں رکھنا شروع کرتی ہیں کہ اتنے میں بارہ پندرہ پولس کے سپاہی دندناتے اس گھر میں گھس آتے ہیں جس میں کبھی بڑے سے بڑے افسر و حاکم کو قدم رکھنے کی مجال نہیں ہوئی۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم تمھارے گھروں کی تلاشی لے کر اُسے "سیل" کریں گے...... ہمیں یہی حکم ہے...... چنانچہ تینوں گھروں کی

(جو ایک دوسرے سے ملے ہوئے اسی خاندان کے ہیں) ایک ایک چیز کی تلاشی لی جاتی ہے۔ اور کئی کئی سو برس کے یہ جمے جمائے گھر جن میں دنیا بھر کی ضروری اور غیر ضروری، آرائشی اور نمائشی چیزیں، بیش قیمت جہیز اور بریاں، انمول کتابیں اور بزرگوں کی تصویریں، سبھی کچھ موجود تھا، تلاشی کے بعد سب سامان بند کر کے گھروں کو "سیل" کر دیا جاتا ہے۔ جو چیز بھی یہ عورتیں ساتھ لے جانا چاہتی ہیں کہہ دیا جاتا ہے کہ اس کو لے جانے کا حکم نہیں ہے..... لیکن تمھارا سارا سامان اور گھر بالکل "محفوظ" رہیں گے۔ ہماری "ذمہ داری" ہے........ چنانچہ آدھی رات تک یہ ہنگامہ برپا رہتا ہے اور یہ جب پولس والے چلے جاتے ہیں تو ایک خالی گھر کی زمین پر چادر بچھا کر یہ اپنے گھر میں مسافر قافلہ، بچوں کو گود میں چھپائے باقی رات بھوکے پیاسے گزار دیتا ہے اور صبح ہوتے کوتوالی پہنچ جاتا ہے....... سارے دن اسی طرح بھوکا پیاسا پریشان حال کوتوالی کے سامنے یہ قافلہ پڑا رہتا ہے..... کیونکہ آج کرنال سے ٹرک نہیں آیا ___ اور یہاں پھر ان کے مختصر ترین سامان کی تلاشی لی جاتی ہے.......
لیکن سامان میں ہے کیا دو چار جوڑے کپڑوں اور ایک ایک رضائی کے سوا؟
شام ہوتے یہ خستہ حال لوگ اپنے کسی عزیز کے ہاں رات گزارنے جاتے ہیں، اور اگلے دن صبح اُس فوجی ٹرک میں جو ان کے لئے آئی ہے کئی وقت کے بھوکے پیاسے پریشان حال بیٹھ جاتے ہیں...... اور کئی عزیزوں اور دوستوں کو بھی اپنے ہی خاندان کا ممبر بتا کر ٹرک میں بٹھا لیتے ہیں۔

ٹرک روانہ ہوتے ہیں تو شہر کے پچاسیوں آدمی، پڑوسی، عزیز، ملنے والے، بوڑھی انائیں، پرانی ملازم عورتیں، روتے، ہچکیاں لیتے دور تک ٹرک کے

ساتھ ساتھ بھاگتے ہیں......... جانے اب کبھی زندگی میں پھر ملنا نصیب ہوگا یا نہیں
اب پھر ایک دوسرے کو دیکھیں گے یا ہمیشہ کے لئے چھوٹ رہے ہیں؟

فوجی محافظوں کے حکم سے ان پردہ نشین عورتوں کا برقعہ اتروا دیا جاتا ہے
.... راستے میں اگر لوگوں کو معلوم ہو گیا تو اُن درندوں سے بچانا فوجیوں کے بس کا بھی نہ رہے گا! اور ٹرک کے اندر یہ بوڑھی اور جوان عورتیں ٹھنڈی لوہے کی زمین پر بیٹھی، چادروں سے منھ چھپائے، بچوں کو سینے سے لپٹائے، جان و آبرو کی حفاظت کی دعائیں مانگ رہی تھیں......... ان کے دل درد سے لبریز، ان کی آنکھیں اشک آلود ہیں، ہونٹ پھڑک رہے ہیں، چہرے حسرت و یاس کا آئینہ دار ہیں۔ وہ پھر اپنے گھروں کو آسکیں گی؟ پھر اپنے پیارے وطن میں آکر بسیں گی؟ پھر اس محبوب سرزمین کو دیکھیں گی؟

ٹرک چلا جا رہا ہے......... میرے محبوب باشندوں......... میری چہیتی بیٹیوں کو لئے ہوئے اور وہ دم بدم......... دور ہوتی جا رہی ہیں، ہمارے اپنے گھروں سے......... اپنے محبوب شہر سے......... اپنے عزیزوں اور دوستوں سے .... اپنے اہل وطن سے.........

اور کیا میں آپ کو ابھی سے یہ بتا دوں کہ ان کے "محفوظ" اور "سیلڈ" گھر بہ نہایت اطمینان سے کچھ دن بعد لوٹ لئے گئے...... ایک تنکا ان گھروں میں باقی نہیں بچا۔

اکتوبر کا مہینہ گزرتا رہا...... آہستہ آہستہ ـــــ اسی اضطراب و پریشانی کے عالم میں۔ اس دوران میں پاکستان سے کئی فوجی ٹرک آئے۔ سرکاری ملازموں اور ان کے خاندانوں کو لے جانے کے لئے۔ اس نفسا نفسی کے عالم میں ان لوگوں میں اتنی

ہمدردی تھی کہ اکثر وہ اپنا سامان چھوڑ دیتے تھے اور اس کی جگہ اپنے اُن دوستوں، محلے والوں اور عزیزوں کو بٹھا لیتے تھے جن کا کوئی سہارا نہ تھا۔ یہ سب مجبور ہو کر، حالات کے آگے ہتھیار ڈال کر، اپنا پیارا وطن چھوڑ کر، بغیر ساز و سامان کے ایک اجنبی علاقے میں جا رہے تھے اور انھیں کچھ اندازہ نہ تھا کہ ان پر وہاں کیا بیتے گی...... لیکن بہر حال...... جان بچانے کے لئے انسان کیا کچھ نہیں جھیلتا......

حالی مسلم اسکول خالی ہو چکا ہے...... وہاں کے کچھ پناہ گزین ہیضے سے مر گئے، بہت سے چلے گئے، پیدل پاکستان کی طرف، لیکن کتنوں کو منزل مقصود کی طرف پہنچنا نصیب ہوا؟ اور کتنے راستے میں مذہبی جنون کی بھینٹ چڑھ گئے؟ کون جانے!!

شہر کے باہر ہندو سکھ "شرنارتھیوں" کی تعداد چالیس ہزار کے لگ بھگ ہو چکی تھی اور شہر میں ہر طرف خوف و دہشت کی حکمرانی تھی۔

آخر کار...... نومبر کے شروع میں مجھ پر وہ قیامت گزر گئی جو ہزارہا سال کی زندگی میں، باوجود بڑی بڑی جنگوں کو اپنے سینے پر جھیلنے کے، کبھی نہ گزری تھی۔ جس کی وجہ سے میری شہرت ختم ہو گئی، میری قدیم تہذیب خاک میں مل گئی، میری کئی ہزار برس کی تاریخ کا پرامن تسلسل، جس پر مجھے فخر تھا ٹوٹ گیا ____ امید کی آخری کرن تاریکی کے سمندر میں ڈوب گئی...... اپنے بچوں کو اپنی گود میں چھپائے رکھنے کی آرزو نے دم توڑ دیا۔

شرنارتھیوں کو اور بعض ہندوستانی افسروں کو یہ بات ناگوار تھی کہ پانی پت

ابھی تک خالی کیوں نہیں ہوا ؟ یہاں کے ہندو مسلمانوں کے تعلقات اب تک خراب کیوں نہیں ہوئے ؟ تعصب کے اندھوں کو ہندو مسلم ملاپ کا یہ روشن گوشہ ناگوار معلوم ہوتا تھا۔ اُدھر بعض شرنارتھیوں کو انتظار تھا کہ مسلمان یہاں سے نکلیں تو ان کی جائدادوں اور مکانوں پر قبضہ کیا جائے۔ چنانچہ معاملات کو تیزی کے ساتھ آگے بڑھانے کے لئے انھوں نے اسٹیشن کے قریب ایک محلے پر حملہ کیا اور کچھ جوان عورتوں کو پکڑ کر لے گئے...... میرے مرد جواب تک صبر کی سل دل پر رکھے ہوئے تھے اس آخری کاری ضرب کو نہ سہہ سکے جوان کی عزت پر پڑی تھی۔ اس محلے کے اکثر نہتے مگر جوش میں پاگل اور بدحواس مرد نکل پڑے۔ مرنا ہر حال ہے پھر لڑ کر کیوں نہ مریں ؟ اپنی آنکھوں سے اپنی عزت لٹتی کیسے دیکھیں ؟ نتیجہ جو ہونا تھا وہ ہوا۔ لڑائی ہوئی جس میں میرے بہت سے بچے بعض لڑتے لڑتے، بعض گھروں میں بیٹھے ختم کر دیئے گئے...... محلے لٹنے لگے، لوگ بھاگنے لگے، فوج اور پولیس نے دخل دیا، گولی چلائی، اور زیادہ لوگ زخمی ہوئے اور مرے...... میرے مجبور باشندے بھی اور یہ نئی قسم کے مہمان بھی جو بن بلائے چاروں طرف منڈلا رہے تھے۔ میرے ہندوؤں نے اس خوں ریزی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ دو چار فتنہ پرداز طبیعتوں کو چھوڑ کر زیادہ تر وہ اپنے مسلمانوں بھائیوں کی مظلومی سے متاثر تھے، لیکن خوف زدہ تھے اور کچھ نہ کر سکتے تھے۔ پولس والوں نے کئی دن کا مسلسل کرفیو لگا دیا اور اس اندھیر گردی میں غنڈوں نے، شرنارتھیوں نے، محافظوں نے جو لٹیرے بن گئے دل کھول خالی اور بھرے، "سیلڈ" اور غیر سیلڈ گھروں کو لوٹا۔ اور گھر والوں کو محلوں سے گھروں سے نکال کر شہر کے اندرونی حصے میں اس طرح بھر دیا جیسے ڈربوں میں مرغیوں کو...... انصاف کا دیوتا تو ہمیشہ سے تصویروں میں اندھا دکھایا

گیا ہے، اس وقت قانون کا دیوتا بھی اندھا اور اپاہج ہو کر کہیں غائب ہو گیا تھا!

اور آخر اس ظلم و ستم کی بھنک مرکزی حکومت کے کان میں پڑی ....

راج کماری امرت کور........ صحت کی وزیر خود پانی پت آئیں اور زخمیوں اور بیماروں کی دردناک حالت دیکھ کر ان کا دل لرز اٹھا اور انھوں نے دہلی سے دواؤں اور ڈاکٹروں کا کچھ انتظام کیا۔ کچھ اور بڑے افسر آئے، دلی سے مدراسی فوج بھیجی گئی جس نے آکر بپھرے ہوئے فسادیوں کو روکنے اور قتل و غارت کے اس ہنگامے کو دبانے کی کوشش کی......

اور پھر...... ایک دن...... ہندوستان کا سب سے بڑا..... سب سے بڑا...... سب سے زیادہ رحم دل...... سب سے زیادہ انصاف پسند انسان جس کے دل میں سارے عالم انسانیت کا درد تھا، جس کے نزدیک ہندو مسلمان سکھ کی تقسیم بے معنی تھی، میری مصیبت و تباہی کا حال سن کر، اپنے سارے ضروری کام چھوڑ کر میرے ہاں آیا..... مہاتما گاندھی!! انھوں نے شہر سے باہر پڑے ہوئے ہزاروں شرنارتھیوں کی تباہ حالی اور مصیبت دیکھی اور افسروں اور حاکموں کو غیرت دلائی! انھوں نے مسلمانوں کی حالت دیکھی اور انھیں خدا پر بھروسہ رکھنے اور ہمت و استقلال سے مصائب کا مقابلہ کرنے کی ہدایت کی..... انھوں نے ہندو اور مسلمان نمائندوں سے ملاقات کی اور ان کی رام کہانی سنی۔ ہندوؤں نے کہا ہم نہیں چاہتے مسلمان پانی پت سے جائیں۔ ہمارا ان کا کوئی جھگڑا نہیں، ہم پرانے ہم وطن اور دوست ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ یہیں رہیں۔ مسلمانوں نے کہا ہماری عافیت آج کل تنگ ہے لیکن ہم اپنا وطن چھوڑنے کو تیار نہیں۔ حکومت ہماری حفاظت کا انتظام کر دے تو ہم کیوں اپنا گھر بار چھوڑ کر اور کہیں جائیں اور مصیبت بھریں؟ گاندھی جی نے ان کو تسلی دی، افسروں کو

سمجھایا، ہندوؤں اور سکھوں کو سمجھایا، شرنارتھیوں کو سمجھایا، حکومت پنجاب کو اس کے حقیقی فرائض یاد دلائے۔ جو کچھ کر سکتے تھے وہ کیا اور واپس چلے گئے۔ لیکن صوبائی حکومت میرے مصیبت ماروں کے لئے کچھ نہ کر سکی۔ یا اس نے کچھ نہ کیا۔ میں نے سنا کہ وہ طے کر چکے تھے کہ جس طرح سارا مشرقی پنجاب مسلمانوں سے خالی کرا لیا گیا ہے اسی طرح ہندو مسلم سلوک کی یہ آخری یادگار، ایک ڈوبتے ہوئے سورج کی یہ آخری حسرت بھری کرن بھی اندھیرے کے طوفان میں ڈوب جائے گی۔ ہزاروں ہندو سکھ پناہ گزین تباہ حال مصیبت مارے شہر سے باہر، سردی اور بھوک سے نیم جان پڑے تھے۔ اگر صوبائی حکومت ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتی تو پاکستان کے مظالم کے بدلے میرے غریب اور بے آسرا مسلمانوں کو سزا تو دے سکتی ہے!

میرے باشندوں کی حالت بد سے بدتر ہو چکی تھی، وہ اپنے وطن میں اجنبی تھے، اپنے گھروں میں بے خانماں تھے، ان کے گھر بار اور جائداد لٹ چکی تھی۔ ان کا اثاثہ ختم ہو چکا تھا، وہ روٹی کپڑے کے محتاج تھے، ان پر زمین اور آسمان دونوں تنگ ہو گئے تھے۔ ان کی فریاد کوئی نہ سنتا تھا......... لیکن گاندھی جی کی اتاہ محبت اور ہمدردی نے پھر زور کیا اور وہ دوسری مرتبہ میرے یہاں تشریف لائے، حالات سازگار ہوتے تو میرے لئے کتنی مسرت اور فخر کا مقام تھا......... مگر آج ....

آج تو سوا درد کے اور کوئی جذبہ میرے دل میں باقی نہ تھا ——— ان کی کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ اور آخر کار......... ہار کر......... مایوس ہو کر، ماضی کی یادوں کو خاک کر کے، مستقبل کی امیدوں کو بھینٹ چڑھا کر، ان بے چارے مسلمانوں کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ اور مجھے آٹھ نو سو برس کے بعد ان کے ساتھ محبت کا رشتہ توڑنا

پڑا۔

پاکستان سے اسپیشل ٹرینیں آئیں اور یہ لوگ جانے لگے ——— جو لٹ چکے تھے ان کو تو کوئی کھٹکا ہی نہ تھا، جن کے گھر بار ابھی تک محفوظ تھے وہ چند کپڑوں اور بستر وغیرہ کے سوا کچھ نہیں لے جا سکتے تھے۔ ..... اجازت نہ تھی ...... ریلوں میں جگہ نہ تھی .... دلوں میں انسانیت نہ تھی۔

اسّی اسّی برس کے بوڑھے، اپاہج اور معذور، غریب اور اندھی بڑھیاں جن کا کل سرمایہ ایک چھوٹا سا ٹوٹا ہوا گھر تھا، امیر اور کھاتے پیتے لوگ جن کے سینکڑوں برس کے جمے ہوئے گھروں میں بہت سا قیمتی سامان جمع تھا، کاروباری لوگ جن کا کاروبار پھیلا ہوا تھا، کاریگر جن کی کاریگری کی دور دور تک دھوم تھی، زمیندار جن کا گذارہ ان کی زمینوں کی آمدنی پر تھا، کاشتکار جن کو اپنی زمینیں جان سے زیادہ عزیز تھیں، گھوسی جن کو اپنی بھینسوں کے گلوں پر ناز تھا کہ ایسا دودھ اور بالائی ہندوستان بھر میں کہیں نہیں ملتی۔ کمبل بنانے والے جنھوں نے جنگ کے زمانے میں لاکھوں کمبل بنا کر فوجیوں کو سردی کی آفت سے بچایا تھا ...... چند علم دوست ...... جن کو اپنے کتب خانے اور کتابیں دنیا کی ہر چیز سے زیادہ پیاری تھیں ..... غرض ہر شخص ...... اپنا سب کچھ چھوڑ کر ...... آنکھیں پُرنم ...... دل میں حسرت کا طوفان لئے ...... اپنے گھر کو ...... اپنے سامان کو، اپنے وطن کو ...... اپنے اہل وطن کو چھوڑ کر پردیس کو راہی ہوا!

اور میرے ہندو باشندے مسلمانوں کے چلے جانے سے افسردہ، نئے آنے والوں سے خائف، مستقبل کی طرف سے پریشان، بدحواس اپنے گھروں

میں دبکے ہوئے تھے۔

اور آج
آئیے ـــــ دیکھئے میری حالت ـــــ
میرے صاف ستھرے، غریب لیکن سلیقہ شعار گھروں میں گندگی اور پھوہڑپن کا دور دورہ ہے، میری گلیاں غلاظت سے بھری ہوئی ہیں..... میری سڑکوں پر شرنارتھی کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہیں میرے اسکولوں میں اب بچے بچیاں تعلیم نہیں پاتے ـــــ میرے امام باڑوں میں اب شہید انسانیت حسینؑ کی یادگار میں مجلسیں نہیں ہوتیں ـــــ میری درگاہوں میں عرس نہیں ہوتے میری مسجدوں میں اذان کی دلکش صدا بلند نہیں ہوتی ـــــ وہاں ـــــ خدا کے سامنے سجدے میں سر جھکانے والے نہیں رہے ـــــ آپس کی محبت اور مروت نہیں رہی، شرافت اور وضع داری نہیں رہی، ہندو اور مسلمانوں کے سلوک کی رسم نہیں رہی.......

آج میرے ہاں بیماری ہے، تباہی ہے، غلاظت ہے، گندگی ہے ایک ان جان اکھڑ زبان سنائی دیتی ہے جس کو میں سمجھ نہیں سکتا، اجنبی صورتیں نظر آتی ہیں جن کو میں پہچان نہیں سکتا، ایک نئی معاشرت ہے جس کو میں پسند نہیں کرتا ـــــ میرا جسم زخمی ہے ـــــ میرا دل زخمی ہے میرا دماغ زخمی ہے۔

آئیے دیکھئے! یہ ہزار برس پرانا مسلمانوں کا وطن۔ یہ بوعلی قلندر مخدوم صاحب اور ملک علی کا وطن ہے ـــــ یہ حالی کا سجاد حسین کا

وطن ہے ـــــــ یہ غلام حسنین اور غلام ثقلین کا وطن ہے ـــــــ یہ صوفی اقبال تقاء اللہ اور حافظ فیاض کا وطن ہے ـــــــ یہ دکشن بندو گپتا اور شانتی سروپ بھٹناگر کا وطن ہے ـــــــ یہ عباس اور سیدین کا وطن ہے۔

یہ وہ شہر ہے جسے اپنی ہر چیز پر ناز تھا ـــــــ اپنے دسہرہ پر، اپنے عرس پر، اپنے نیکھے پر، اپنی ہولی پر، اپنی عید پر، اپنے محرم پر۔ جسے اپنے سپوتوں پہ ناز تھا اپنی باعصمت اور خوددار عورتوں پر ناز تھا، اپنے باشندوں کے باہمی اتحاد اور اتفاق پر ناز تھا، اپنی امن پسندی اور شرافت پر ناز تھا ـــــــ اپنی غربت اور وضع داری پر ناز تھا.......

آئیے اور آج مجھے دیکھئے اور بتائیے کہ مجھے کس قصور پر تباہ کیا گیا ـــــــ میرے بے گناہ اور بے آسرا باشندوں کو کس گناہ کی پاداش میں جلا وطن کیا گیا؟

آہ...... کوئی مجھے بتائے کہ.......

ناعاقبت اندیش سیاست والوں کی حرکتوں کی سزا مجھے کیوں ملی؟

لیڈروں کی غلط پالیسی کا شکار مجھے کیوں بنایا گیا؟

فرقہ وارانہ منافرت کا قہر مجھ پر کیوں لوٹا؟

ہندوستان کے بٹوارے کی سزا مجھے کیوں بھگتنی پڑی؟

میرا کیا دوش تھا؟ کیا گناہ تھا؟

شاید ـــــــ شاید ـــــــ میری طرح اور ہزاروں گاؤں اور قصبے بھی تباہ ہوئے ہوں ـــــــ کون جانے؟ میں تو اپنی ہی بپتا جانتا ہوں اور وہی سنا سکتا ہوں۔

آخری سہارا

میں کون ہوں ؟

حسن و جمال کا مرقع، لطافت و نزاکت کا مجسمہ، نگینیوں کی دنیا، قدرت کا حسین ترین شاہکار...... خالقِ کائنات کی لطیف ترین تخلیق !

ایسے ایسے کتنے خوبصورت ناموں سے مجھے یاد کیا جاتا ہے۔

میں انسان کو جنم دیتی ہوں، انسان کی پرورش کرتی ہوں، آدمیت کو سنبھالتی ہوں..... میرے ہی وجود سے دنیا قائم ہے، میری ہی ذات سے دنیا کے بزرگ ترین انسانوں کی قبائے صفات بنی ہے۔

سقراط اور افلاطون، عیسیٰؑ اور محمدؐ، حسینؓ اور علیؓ، کرشن اور بدھ، لنکن اور گاندھی، اقبال اور ٹیگور میری ہی ڈالی کے پھل، میرے ہی باغ کے پھول، میری ہی ریاضت کے ثمر ہیں۔

میں حوّا ہوں، مریم ہوں، ہاجرہ ہوں، خدیجہ ہوں، فاطمہ ہوں، زینب ہوں، رابعہ بصری ہوں.......

میں کوشلیا ہوں، سیتا ہوں، ساوتری ہوں، چاند بی بی ہوں، رانی جھانسی ہوں، نور جہاں ہوں، زیب النساء ہوں، میں سروجنی ہوں، کستوربا ہوں.....

میں عورت ہوں !!

دنیا کی سب سے زیادہ محبوب، عزیز، حسین، پوتر اور مقدس ہستی !
دنیا کی سب سے زیادہ مظلوم، دکھیا آفت نصیب ہستی !
میں خوش قسمت، فرض شناس، ایمان کی شمع بردار، ان ینت کی حامل ہوں.......

میں علم سے محروم، جہالت کی ماتی، بوجھوں سے دبی، بے کس بے بس ہستی ہوں.........

خالقِ کائنات نے میرے لئے ماں کا متبرک مقام مقدر کیا تھا!
اس کی بدبخت مخلوق نے مجھے اس پوتر آسن سے کھینچ کر اپنے ہوس کے ناپاک تخت پر گرادیا........

میں عورت ہوں !!
قدرت کا حسین ترین شاہکار......
انسان کا مظلوم ترین شکار........

عورت !!!

ہزاروں برس سے میں مرد کے ہاتھوں ظلم و ستم، ذلت اور غلامی کی زندگی بسر
رنے پر مجبور رہوں، کہیں مجھے مالک سے لونڈی بنا کر رکھا گیا...... کہیں مجھے بیوی اور ماں
نانے کے بجائے ہوس رانیوں کا آلہ کار بنا کر ذلیل کیا گیا.... کہیں مجھے پیدا ہوتے
ی زندہ دفن کیا گیا...... کہیں مجھے جوانی میں شوہروں کے ساتھ زندہ چتا میں جلایا گیا۔
میں علم کی روشنی سے محروم، گھر کی چار دیواری میں بند، دنیا سے بے خبر،

صرف مرد کی ذلیل لونڈی اور اس کی خود غرضی کا شکار بنی رہی۔

کہیں کہیں، کبھی کبھی، میری حمایت میں کوئی کمزور سی آواز اٹھتی۔ میری بزرگی اور تقدس کا ہلکا سا اعتراف کیا جاتا...... مگر عام طور پر یہ آواز اتنی دھیمی یہ اعتراف اس قدر سطحی ہوتا کہ دنیا کے ضمیر پر اور اس کے اعمال پر اس کا کوئی قابلِ ذکر اثر نہ پڑتا تھا۔

اور پھر ہزاروں برس کی ذلت اور مصیبت کی زندگی بسر کرنے کے بعد میری دنیا میں بھی انقلاب آیا۔

ساڑھے تیرہ سو برس ہوئے عرب کے صحرا میں ایک انسان پیدا ہوا...... ایسا انسان جس نے سارے عالم انسانی کی اصلاح اور بھلائی کا بیڑا اٹھا لیا۔ اور جس نے مجھے...... عورت کو...... ذلت، جہالت، محکومی، غلامی، مصیبت اور بے بسی کی زندگی سے نجات دی...... مجھے انسانیت کے سارے حقوق دیئے...... مجھے عزت و احترام کے سب سے بلند درجہ پر فائز کیا......

ہاں دنیا کے رہبر اعظم محمد مصطفےٰ نے ساری دنیا کے مظلوموں کی دستگیری کے ساتھ ساتھ، مجھ پر بھی وہ احسان عظیم کیا جس کے بار سے میرا سر ہمیشہ جھکا رہیگا۔

پھر جہاں جہاں، جیسے جیسے دنیا اس محسنِ انسانیت کی تعلیم کو سمجھتی گئی میری حالت بہتر ہوتی گئی......

لیکن کچھ عرصے بعد —— رفتہ رفتہ —— خود اُس ہادی کے نام لیوا اُس مصلح کے پیرو ہی اس کی تعلیم کو بھولنے لگے —— وہ اُس کی تعلیم کی روح کو سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھے اور رسمی و رواجی مذہب کی بندشوں میں جکڑے چلے گئے میرے

بہت سے حقوق پھر غصب کر لیئے گئے ـــــ میرا احترام ختم ہو گیا، آزادی چھن گئی، مجھے پھر جہالت کی تاریکی میں ڈھکیل دیا گیا ـــــ میری حالت پھر پالتو جانوروں کی سی ہو گئی ....

اور اگر۔ آج ـــــ تم میری سب سے بدتر حالت دیکھنا چاہتے ہو تو ہندوستان آؤ! ہندوستان کی عورت کو دیکھو! جس کی محبت اور وفا، قربانی اور ایثار کے چرچے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جس کی عصمت پروری ضرب المثل ہے، جس کا سینہ نورِ ایمان سے روشن ہے ....

جس کی گود سے ایسے سورما، ولی، رشی، بزرگ انسان پل کر نکلے جنہوں نے بھارت ورش کا نام دنیا میں بلند اور اسے باعزت کیا۔

اور وہ ہندوستانی عورت ـــــ دنیا کی سب سے لاچار، بے بس مخلوق، مرد کی لونڈی، چار دیواری میں بند، ہوا، روشنی، صحت، علم اور عمل ـــــ دنیا کی ساری اچھی چیزوں سے محروم ہے!

ہاں یہاں بھی اکّا دکّا ـــــ کمزور اور دھیمی آوازیں میری حمایت میں کبھی کبھی بلند ہوئیں۔ کوئی لیڈر، کوئی شاعر، کوئی دردمند انسان، کوئی انصاف پسند آدمی، میری حالت دیکھ کر تڑپ اٹھا، چیخ پڑا ـــــ میری حالت بہتر کرنے کی کوشش کی گئی ـــــ اس کا اثر کسی چھوٹے سے حلقے میں ہوا بھی ـــــ کچھ عورتوں کی حالت سنور بھی گئی ـــــ مگر پھر بھی ـــــ عام طور پر ملک کی کروڑوں عورتیں وہی غلامی، مظلومی، بے بسی اور جہالت کی زندگی بسر کرتی رہیں۔

اور پھر پچھلی صدی میں ـــــ آج سے ۷۰ برس پہلے میں نے ـــــ

ہندوستانی عورت نے — ایک سپوت کو جنم دیا — ایک کمزور نحیف سے بچے کو — میں اس وقت نہیں جانتی تھی کہ میں نے کتنا بڑا انسان پیدا کیا ہے — پہلے بھی کبھی نہیں سمجھی تھی — مجھے تو اپنے سب ہی بچے عزیز ہوتے ہیں — سبھی میں ہونہاری کے آثار نظر آتے ہیں!

اور بڑے ہو کر — دنیا کے دوسرے بڑے بڑے ہادی اور رہنماؤں کی طرح، اس بچے نے دنیا کے سارے مظلوموں، محکوموں، بے لبوں کی حمایت کا بیڑا اٹھا لیا۔

ہاں میرا وہ بچہ ایک مکمل انسان بنا — حقیقی رہبر — سچا ہادی — اس نے اتنے بہت سے اچھے اچھے کام کئے جنھیں میں گنا بھی نہیں سکتی — اس نے دیس کو غلامی کی لعنت سے آزاد کرایا، اس نے اچھوتوں کی بگڑی زندگی کو سنوارا، اس نے گاؤں سدھار کا کام کیا — اس نے تعلیم کو، مفید اور اچھی تعلیم کو — زیادہ سے زیادہ لوگوں میں پھیلانے کی کوشش کی۔ اس نے ملک میں اتحاد، اتفاق اور محبت پیدا کرنے کی خاطر اپنی جان تک قربان کر دی — اس نے دنیا میں امن وامان قائم کرنے کے لئے — ایک نرالا ہتھیار ایجاد کیا — یا یوں کہو کہ اس بھولے ہوئے ہتھیار کو پھر سے دنیا کو یاد دلایا — یعنی اہنسا کا، عدم تشدد کا حربہ — ظلم کا جواب رحم سے، نفرت کا محبت سے دینا — بدلے اور انتقام کی جگہ عفو کا پرچار کرنا اس کا مقصد تھا اور اس کی ساری زندگی اس کی تعلیم اور اصولوں کا جیتا جاگتا نمونہ تھی!

اور یہی امن کا دیوتا، انصاف کا ساتھی، حق کا پجاری، بے لبوں کا سہارا،

یہی رحم اور دیا کا دیوتا، میری حمایت اور بہبود کے لئے بھی کمربستہ ہوگیا۔

جب دیس میں ایک طرف عورت کے نصیب میں صرف جہالت اور محکومی کی زندگی تھی اور دوسری طرف ایک محدود "مہذب" طبقے میں عورت کو تتلی اور نمائشی گڑیا کی سی حیثیت دی جارہی تھی —— اس دردمند انسان نے دنیا کے سامنے میرا صحیح مقام پیش کیا۔

اس نے دنیا کو بتایا کہ عورت بھی انسان ہے۔ اُسے انسانیت کے سارے حقوق ملنے چاہئیں۔ وہ مرد سے کمتر ہرگز نہیں —— کمتری کا احساس مرد نے ہزاروں برس سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کی وجہ سے اس میں پیدا کردیا ہے۔ ورنہ وہ مرد سے گھٹیا نہیں بلکہ بعض لحاظ سے افضل ہے۔ اُس نے بتایا کہ بیوی شوہر کی لونڈی نہیں بلکہ اس کی رفیق اور مددگار ہے —— اور اسے بھی اپنے راہِ عمل کے انتخاب میں اسی طرح آزادی حاصل ہے جس طرح اس کے شوہر کو۔ اُس نے عورت کو عفو کی مورتی، برداشت اور صبر کی دیوی، اہنسا اور عدم تشدد کی امین اور انسانیت کو اپنانے اور انسان کو پیدا کرنے والی بتایا —— اس نے عورت کو خود اس کا درجہ اور فرائض سمجھائے —— اس کی ہر بُری اور غلط بات کی اصلاح کی کوشش کی۔

اور ساتھ ہی اس عارف نے دنیا کو یہ بھی سمجھایا کہ قدرت نے مرد اور عورت کے عمل کی تقسیم الگ الگ کی ہے۔ مرد کا کام روٹی کمانا ہے اور عورت کا کام روٹی بانٹنا —— جب مرد ہتھیار اٹھاتا اور گھر کی حفاظت کرتا ہے تو عورت کا فرض اپنے گھر کی دیکھ بھال اور آرام دہ بنانا ہے —— اور اس کا یہ فرض کسی طرح

مرد کے فرض سے کم درجہ کا یا آسان نہیں —— اُس نے کہا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ عورت کو بھی مرد کے دوش بدوش ہتھیار چلانا چاہئے وہ بڑی خطرناک غلطی کرتے ہیں دنیا میں امن و امان صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ عورت اہنسا کے اصول کو پوری طرح اپنا لے —— اس سے زیادہ اور کسی میں اس اصول کو اپنانے کی صلاحیت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ صبر اور برداشت، عفو اور رحم اور اتھاہ، بے کراں محبت کا ذخیرہ اس کے دل میں پوشیدہ ہے۔ اور پھر عورت ہی اپنے بچوں کو اس ظلم و وحشت سے اور دنیا میں بدامنی پھیلانے سے روک سکتی ہے۔

پھر اُس نے جتنی تحریکیں چلائیں سب میں عورت کو اپنے ساتھ رکھا اور اُسے ان کاموں کے کرنے کا حوصلہ اور موقع دیا۔ آزادی کی جنگ میں عورت ایک بہادر سپاہی کی طرح اس کے ساتھ رہی —— اس لئے کہ یہ جنگ بغیر ہتھیار کی جنگ تھی جو ظلم کے ذریعے نہیں بلکہ محبت کے ذریعے دنیا کو فتح کرتی ہے —— اس کے آشرم میں عورتوں کی گنتی مردوں سے کم نہ تھی اور وہ انھیں اپنی بیٹیوں کی طرح چاہتا تھا۔ ماں کی طرح عزت کرتا تھا —— اور اس نے اپنی بیوی کی —— ایک عورت کی جو یادگار قائم کی اس کا مقصد ہندوستانی عورت کو جہالت اور غربت کی زندگی سے نکال کر علم و عمل کی روشنی سے منور کر کے باعزت زندگی کا گُر سکھانا تھا!

میں نے بچپن میں اس کا نام موہن داس کرم چندر رکھا تھا۔ بڑا ہو کر یہ گاندھی کے نام سے ساری دنیا میں مشہور رہا۔

ہندوستان میں بہت بڑے بڑے آدمی گزرے —— رشی، منی، ولی مہاتما، لیڈر، شاعر، ادیب، بزرگ، سیاست داں، لیکن میرے لئے ——

جو کچھ اس کمزور و نحیف انسان نے کیا، میری حمایت جس طرح اس نے کی، میری اصلاح اور بہبود کی جیسی زبردست اور منظم کوشش اس کی بدولت اور اس کے ہاتھوں ہوئی.. ایسی آج تک اس دیس میں کسی نے نہ کی تھی ـــــــ اور کسی دیس میں بھی نہ کی گئی تھی۔ ہاں ساڑھے تیرہ سو برس پہلے عورت کی حمایت میں جو آواز عرب کے صحرا میں بلند ہوئی تھی آج اس کی بازگشت گاندھی کی بدولت ہندوستان میں سنائی دی۔

پر دنیا کے رہبر اور مصلح اپنی بات بتا سکتے ہیں، سمجھا سکتے ہیں...... زبردستی منوا تو نہیں سکتے؟ اس میں شک نہیں کہ ان کی تعلیم اثر ضرور کرتی ہے۔ ان کی محنت رائگاں نہیں جاتی، آخر کار ان کا مقصد پورا ہوتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ اس کا اثر فوری ہو اور سب پر ہو۔ اچھی بات کو سننے اور سمجھنے کے لئے، حق کو قبول کرنے کی صلاحیت بھی تو ہونی چاہیے۔ اندھے بہرے کو کوئی کیا سنا سکتا ہے، کیا سمجھا سکتا ہے

مہاتما گاندھی نے اپنی ساری زندگی تج دی تھی کس لئے؟ ملک کو غلامی کی لعنت سے نکالنے کے لئے، ملک والوں میں اتحاد اور محبت پیدا کرنے کے لئے، دیس کو متحد رکھنے کے لئے، ظلم اور تشدد، نفرت اور تعصب کو مٹا کر امن و سلامتی کی دنیا بنانے کے لئے ـــــــ عورت کو عزت ـــــــ سکھ، اور شانتی کی دولت بخشنے کے لئے

لیکن بظاہر کیا ہو رہا ہے؟

دیکھتے دیکھتے ہندوستان میں اتفاق کی جگہ نفاق بڑھا، محبت کی جگہ نفرت پیدا ہوئی، دیس متحد ہونے کی جگہ دو حصوں میں بٹ گیا۔ اور آزادی ملی مگر اسے پاکر اکثر لوگ وحشی درندے بن گئے ـــــــ اس سے بھی بدتر۔ اہنسا اور عدم تشدد کی

جگہ ظلم و بربریت کا دور دورہ ہو گیا۔ بھائی بھائی کا دشمن بن گیا ——— بقول میرے اس دیس کے انسان انسان کو "کاٹنے" لگا ——— دھرتی ماتا ہزاروں زخموں سے چور، درد سے بے قرار، شرم سے سرنگوں، خون میں نہائی بے بسی سے اپنے سپوتوں کی یہ وحشیانہ حرکتیں دیکھ رہی ہے۔

اور اس وقت امن کا دیوتا، اہنسا کا پجاری، انسانیت کا محسن یہ خونیں مناظر دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ اس کا دل، دماغ، جسم اور روح درد میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وحشت اور جنون کے اس طوفان میں جہاں انسانیت ڈوب رہی تھی، اس کی اکیلی آواز طوفان زدوں کے لئے روشنی کے مینار کا کام دے رہی تھی۔ خانماں برباد، بے وطن، مظلوم، بے سہارا مصیبت ماروں کے لئے اس دردمند انسان کی ذات یاس و نا امیدی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں امید کی شمع بن کر چمک رہی تھی۔ مجھ بدنصیب کا، عورت کا، سہارا بھی اس وقت صرف گاندھی کی ذات تھی!

ہندوستان کو آزادی ملی........

مرد کو من مانی حرکتیں کرنے کا موقع ملا.......

اور اس کا صلہ........ آزادی کی جنگ میں جو کوششیں اور قربانیاں میں نے کی تھیں اس کا بدلہ ——— مجھے ——— مجھ بدنصیب ازلی کو کیا ملا؟

دیس میں جو جھگڑے فساد، خون خرابا، جور و ستم ہوئے ——— جانتے ہو اس کا سب سے بڑا شکار کون ہے ——— سب سے زیادہ دکھ ——— جسمانی دکھ، روحانی کرب ——— کسے سہنا پڑا؟ مجھے.......

عورت کو.......

یہ نواکھلی ہے ـــــ میری عزت اور ایمان پر حملے ہو رہے ہیں ـــــ اور مجھے کوئی سہارا نظر نہیں آتا ـــــ صرف ایک درد کی آواز سنائی دے رہی ہے ـــــ "جب تم اپنی عصمت اور ایمان نہ بچا سکو تو جان پر کھیل جاؤ۔"

یہ بہار ہے ـــــ میرے دیس کے یہ بہادر سورما، میری بے عزتی کا بدلہ ـــــ خود مجھ سے لے رہے ہیں ـــــ میری بھری گود سے بچے چھین کر میری آنکھوں کے سامنے چیر ڈالے گئے۔ بچوں کی غذا کا مخزن ـــــ بچے کی ماں کے سینے سے ـــــ دودھ کی دھاروں کی جگہ خون کی ندیاں بہیں ـــــ ہزاروں بچے اس ماتا کے چشمے سے محروم ہو گئے۔

اور یہ ہے پنجاب ـــــ موجودہ دنیا کا شاید سب سے وحشی، سب سے خونخوار، سب سے خوفناک ٹکڑا ـــــ میرے دل میں اتنی سکت نہیں، میرے پاس وہ الفاظ نہیں ـــــ میری آواز میں وہ قوت نہیں کہ میں ان شیطانی حرکتوں کا کچھ حصہ بھی بیان کر سکوں جو یہاں ہوئے ـــــ خصوصاً میرے ساتھ ـــــ عورت کے ساتھ آپ جانتے ہیں ـــــ میں عورت ہوں ـــــ اور پھر ہندوستانی عورت ـــــ جس کو اپنے گھر، اپنے شہر، اپنے میاں اور بچوں سے عشق ہوتا ہے اور جسے اپنا دھرم اپنی جان سے زیادہ عزیز اور اپنی آبرو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ پیاری ہوتی ہے۔

اور ان وحشیوں نے میری یہ ساری محبوب چیزیں چھین لیں ـــــ اور بیشتر لوگ چپ چاپ دیکھا کیے۔ یا "اپنوں" کے لئے شور مچایا اور "دوسروں" کی بے عزتی اور بدبختی پر خوش ہوئے۔ احمق ـــــ اندھے کہیں کے ـــــ انھیں

یہ نہیں معلوم کہ میرے ہاں " اپنے " اور " غیر " نہیں ہوتے۔

مرد کو ملک جس قدر عزیز ہوتا ہے، عورت کو اپنا شہر اس سے کہیں زیادہ پیارا ہوتا ہے۔ جہاں وہ اپنی ساری زندگی گزارتی ہے ــــ یہی اس کی دنیا ہوتی ہے۔ اور مجھے ــــ مجھے میرے وطن سے نکالا گیا، گھر سے بے گھر کیا، دربدر کی ٹھوکریں کھانے کو

میرے باپ بھائی میری آنکھوں کے سامنے مار ڈالے گئے ــــ اور میں کچھ نہ کر سکی!

میرے چہیتے شوہر کو مار کر مجھے سہاگن سے بیوہ بنایا ــــ میری دنیا اجاڑ ڈالی

میری گود سے میرے لال چھین لئے گئے۔ ان معصوم ننھے فرشتوں کو، ان بے زبان دیوتاؤں کو، میری ان پتھرائی آنکھوں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا.....

اور ــــ اور سب سے کاری چوٹ ــــ سب سے گہرا گھاؤ

جو میری روح پر اس آزادی کے بعد لگایا گیا وہ میری عصمت پر مرد کا وحشیانہ اور شیطانی حملہ تھا۔

مجھے معلوم ہے ــــ دنیا میں ہر جگہ اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ بد چلن اور بد اخلاق اور بے حس لوگ ہوتے ہیں۔ جن کے نزدیک عورت ایک کھلونا ہے ان کی ہوس رانیوں کا ــــ وہ عورت کے تقدس سے بے خبر، اس کی محبت اور وفا کے منکر، جانوروں جیسے ہوتے ہیں.......

ہاں یہ میں جانتی ہوں.......

لیکن جو شیطانی سلوک ـــــ دس بیس نہیں ـــــ سو پچاس نہیں، ہزاروں لاکھوں کے ساتھ پچھلے ڈیڑھ سال میں ہندوستان کے مردوں نے عورتوں کے ساتھ کیا (میں جب ہندوستان کہتی ہوں تو میرا مطلب اُس وقت اُس حصّہ ملک سے بھی ہوتا ہے جسے اب دوسرا نام دے دیا گیا ہے ....) معصوم کنواریوں، نوجوان سہاگنوں، یہاں تک کہ بڈھی اور ادھیڑ ماؤں کے ساتھ ـــــ جو کچھ کیا گیا ـــــ اس کی مثال ـــــ کم سے کم ہندوستان کی تاریخ میں مجھے نظر نہیں آتی۔

میں ـــــ عورت ـــــ بے بس عورت ـــــ کمزور اور ہار جانے والی بدنصیب مخلوق ـــــ میں ہندو، سکھ ـــــ مسلم عورت ـــــ ہندوستانی عورت ـــــ یوم انصاف داورِ محشر سے فریاد کرے گی ـــــ یہ سوال کرے گی کہ اس نے عورت کو کیوں پیدا کیا؟ کیوں اُسے اس قدر بے بس اور لاچار بنایا ـــــ اتنا مجبور کہ وہ اپنی آبرو بھی وحشی درندہ صفت مردوں سے نہ بچا سکے؟

تم سوچ رہے ہو ـــــ یہ تو عورت ہے ـــــ جذبات کی رَو میں بہنے والی، خواہ مخواہ چھوٹی سی بات کو بڑھانے والی ـــــ حساس اور ناقص العقل عورت دنیا میں ایسی باتیں ہوا ہی کرتی ہیں۔ ان کا اس شدت سے کیا گلہ؟ کیا عورت بری نہیں ہوتی؟ ظالم نہیں ہوتی؟ بدچلن نہیں ہوتی؟ مگر عورت کو تو شوق ہوتا ہے مرد کو الزام دینے کا ـــــ اپنے کو مظلوم ثابت کرنے کا۔

ہاں تم یہ سوچ رہے ہو! مرد ہو نا! لطیف احساسات سے بے گانہ۔

لیکن میں ـــــ عورت ـــــ اپنی بات کے ثبوت میں تمھیں ہزاروں واقعات سنا سکتی ہوں، ہزاروں ایسے ہولناک مناظر دکھا سکتی ہوں کہ تمھارے رونگٹے کھڑے

عورت کا انتقام نہیں لے سکتی ؟

یہ کیمپ ہیں ـــــ ہندو اور سکھ رفیوجیز کیمپ ـــــ مسلمان پناہ گزینوں کے کیمپ ۔ یہ قافلے جا رہے ہیں ـــــ مشرقی پنجاب سے مغربی پنجاب کی طرف اور مغربی سے مشرقی کی طرف ـــــ ان پر بار بار چڑھائیاں ہوتی ہیں، دھاوے ہوتے ہیں ـــــ ہندوؤں اور سکھوں کے ـــــ مسلمانوں کے ـــــ بعض اوقات خود محافظوں کے ـــــ ہر فریق دوسرے کے مردوں کو مارتا ہے ـــــ بچوں کو مارتا ہے ـــــ اور عورت کو ـــــ آہ ـــــ جس کی سب سے بڑی خوش نصیبی اور آرزو یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے پیاروں کے سامنے دنیا سے جائے ، اکثر اُسے زندہ چھوڑ دیا جاتا ہے ۔ رحم کھاکر ؟ مجبور اور کمزور سمجھ کر ؟ جی نہیں ! مجبوروں اور کمزوروں پر تو ان " بہادر سورماؤں " کا ان " مجاہدین " اور " غازیوں " کا ہاتھ سب سے پہلے اُٹھتا ہے ۔ عورت کو زندہ چھوڑا جاتا ہے اپنی ہوس کے لئے ـــــ اپنی ناپاک خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ـــــ اور آہ ـــــ قدرت کی یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ ان سینکڑوں درندوں کے سامنے عورت کا اتنا بس بھی نہیں رہتا کہ وہ مر ہی جائے ـــــ مرنا بھی اُس کے اختیار سے باہر ہو جاتا ہے !!

یہ چند فوجی بیٹھے ہیں ۔ ملک کی حفاظت کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر ہے ـــــ کمزور کی حمایت ان کا پہلا فرض ہے ......

زرا سننا اُن کی باتیں !

" کیوں بھئی ہمارا قصہ تو سن چکے اب یہ بتاؤ کہ تمہارے ہاتھ بھی کچھ " مال "

آیا؟"

"ہاں ہم نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا۔ ایک دن ہم پانچوں دوست گئے اور رفیوجیز سے پانچ خوبصورت لڑکیاں پکڑ لانے ——— جس نے دخل دیا اُسے اُس کا نتیجہ بھگتنا پڑا ———"

"یار کیا لڑکیاں تھیں وہ بھی۔ حسن کی مورتیاں، معصومیت اور پاکیزگی کی دیویاں۔"

"سچ مچ کیسی پیاری، کیسی سندر تھیں وہ ——— مجھے آج تک ایسی عورتوں سے سابقہ نہ پڑا تھا۔"

"خوب کٹے ان کے ساتھ وہ چند گھنٹے۔"

"اور اب وہ لڑکیاں کہاں گئیں؟ ہم بھی ذرا دیکھتے ان کو۔"

"وہ معاملہ تو ختم ہوا۔"

"کیا مطلب؟"

"ارے یار احمق ہو تم بھی ——— جب ہمارا کام نکل چکا تو پھر ہم ان کو کیا کرتے خواہ مخواہ کا خطرہ ہی تھا ———"

"تو کیا واپس چھوڑ آئے اُن کے کیمپ میں؟"

"نہیں ——— ہم نے ان پانچوں کو "شوٹ" کر دیا!!!"

اور فضا میں پانچ خوفناک قہقہے گونج اٹھے......

ارے! تم ابھی سے کانپ اٹھے...... ابھی تو دو تین قصے ہی سنے ہیں ——— ابھی تو تم نے یہ نہیں سنا کہ دلی میں مجھ پر کیا کیا بیتی ——— لاہور میں،

جالندھر میں، گاؤں میں، قصبوں میں، میں نے کیا کیا سہا......

...... یہ سب تم سن نہیں سکتے — میں سنا نہیں سکتی۔

ملک میں ایک لاکھ کے قریب عورتیں ایسی ہیں جن کو لوگ زبردستی
گئے تھے۔ جن کی آبرو چھین لی گئی، جن کا مذہب جبرًا بدل دیا گیا ہے۔ جن
رنٹ چکے ہیں...... عزیز اقارب چھوٹ چکے ہیں۔ جن کو ان کے اعزا،
ادری، ان کا سماج واپس اپنے میں ملانے کے لئے تیار نہیں!! ان بے گناہ
مجبور عورتوں کو جن کا اپنا کوئی قصور نہ تھا — سوا اس کے کہ وہ عورت
— ظالم، وحشی مرد کے سامنے بے بس ہو جانے والی ہستی! اور اب بھی
— اُسی فرقے سے تعلق رکھنے والا مرد — شرم سے زمین میں گڑ نہیں
اُس کے ضمیر میں خلش نہیں پیدا ہوتی کہ یہ سب اُس کا —
— قصور ہے۔ اب بھی اُس کے نزدیک عورت ہی پاپی ہے۔ اچھوت
... بے آبرو ہے جنھیں یہ "عصمت مآب" مرد قبول نہیں کر سکتا —
پسند" اور "باعزت" سماج معاف نہیں کر سکتی۔

یہ سب ہوتا رہا اور ہو رہا ہے۔ مگر ملک کے ضمیر پر بیشتر لوگوں کے
پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ اب بھی اُسی بے حسی اور بے پروائی کے ساتھ لوگ
سیموں، اپنی تفریحوں، اپنے عیش و عشرت میں مصروف ہیں۔ تھیٹر اور
اب بھی اُسی طرح عشق و عاشقی کی کہانیاں دکھا رہے ہیں...... بیشتر
ے اور رسالے اب بھی جنسی، رومانی اور خیالی قصوں سے بھرے ہوتے ہیں۔
ے لے لے کر پڑھے جاتے ہیں — اب بھی آرٹ کے پجاری اور آرٹسٹ

اُسی طرح عورت کے جسم اور حسن کی نمائش کرکے اُسے آرٹ کا نام دے
لیکن ان کے دل پر آرٹ کے اس مرکز، قدرت کے اس شاہکار کی ذلت
سے چوٹ نہیں پڑتی ۔ اب بھی لوگ اپنے ضمیر پر آنچ نہیں آنے دیتے، دل
لگنے دیتے ـــــ دماغ کو سوچنے نہیں دیتے ۔

اب ۔ جبکہ ضرورت تھی کہ ہر کام، ہر بات، ہر دلچسپی کو بھلاکر،
اور دردمند لوگ اپنے وحشی درندہ صفت ہم جنسوں کی حرکتوں کی تلافی ہی کے
اس شرمناک الزام کو کم سے کم اپنے ہی سر سے ہٹانے کی خاطر
تن، من، دھن سے، دُکھیا، بدنصیب عورت کی مصیبتیں دور کرنے کی کو
کرتے ......

اب جس وقت حکومت کا، عوام کا، ادب کا، آرٹ کا، ہر عورت
مرد کا یہ فرض تھا کہ وہ پوری قوت کے ساتھ ان مظالم کے خلاف احتجاج کر
ان تباہیوں کو روکنے کی ان تھک کوشش میں لگ جاتے ـــــ اس وقت صرف
ایک آواز ـــــ وہی حق پسند، انصاف پرست دردمند آواز آج بھی بلند
پہلے میری حمایت کے لئے بلند ہوئی تھی ۔ وہی ـــــ گاندھی کی آواز ۔

اگر اس وقت مہاتما گاندھی نے ـــــ ہندوستانی مرد کی وحشی
اور شیطانی حرکتوں کے خلاف اس سختی سے احتجاج نہ کیا ہوتا، ان حرکتوں سے
اور اُن مردوں کو اتنی سخت مذمت نہ کی ہوتی تو آج میں یہ کہہ سکتی تھی کہ ہندو
کے مرد کو کہیں دنیا میں منہ دکھانے کی جگہ نہیں رہی ـــــ میں کہتی کہ مرد اس
کہ عورت اس کی عزت کرے ۔ اس سے کوئی واسطہ رکھے ـــــ اس سے کبھی

..

لیکن اس مردِ مجاہد، اس بہادر سورما —— نے میرے غصّے اور غضب کو
ائی جنس کا ایک فرد تو ہے جو میرے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہے۔ جو تُل
ری حمایت پر، میری مصیبت دور کرنے کا جس نے تہیہ کر لیا ہے ....
دل کو مجھ سے زیادہ میری حالت کا احساس اور صدمہ ہے۔

یہ گاندھی ہی تو تھا جس نے سب سے پہلے علی الاعلان، ڈنکے کی چوٹ
ن عورتوں پر زبردستی کی گئی ہے وہ اب بھی معصوم ہیں، پاکباز ہیں۔ نیردوشس
یمان ہیں۔

اس نے مردوں کو تنبیہ کی —— ملامت کی —— شرم
—— اُس نے اُن عورتوں کے عزیزوں کو سمجھایا کہ وہ پھر عزت اور احترام
پنی عورتوں کو اپنے گھروں اور خاندانوں میں واپس بلائیں اور ان کے ٹوٹے
رنے کی کوشش کریں۔ اُس نے یہاں تک کہا کہ وہ سب میری بیٹیاں ہیں۔
ہیں، میرے گھر میں ان کے لئے جگہ ہے ......

لیکن آج —— عصمت پروری کے اصلی معنی سمجھنے والا یہ عارف، بے
ندوستانی عورت کا یہ محسن، مصیبت ماروں کا یہ آخری سہارا ......
...... اُس نے لوگوں کو امن واتفاق ...... حق اور باطل کے معنی سمجھانے
ہ اپنی جان قربان کر دی ہے ...... وہ واحد آواز جو میری حمایت میں بلند
تھی خاموش ہے —— وہ رہبر جو دنیا کو میرا مقام سمجھا رہا تھا جامِ
ت سے سیراب ہو کر عالمِ جاودانی کی طرف جا چکا ہے ...... میرا آخری